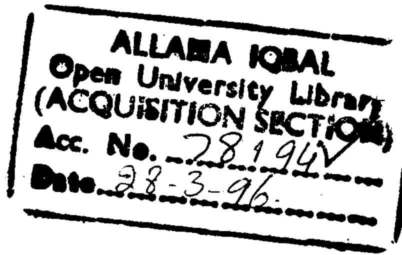
سلیم واحد سلیم کے کلام
کی تدوین

O



مقالہ

برائے ایم - فل (اردو)

مقالہ نگار: تابندہ بتول

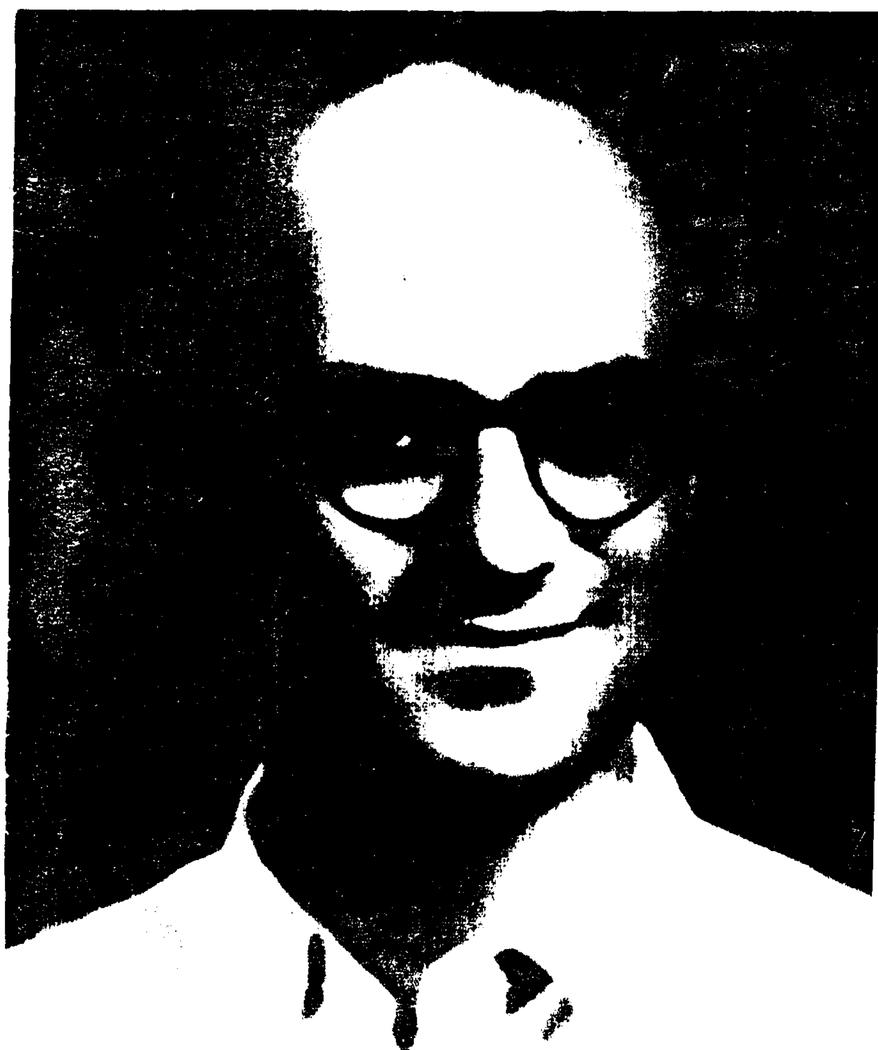
متعلمہ ایم - فل (اردو)

نگران: پروفیسر ڈاکٹر آغا سہیل

سابق صدر شعبہ اردو

گورنمنٹ ایف - سی کالج لاہور

(اس مقالے کی منظوری علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے مراسلہ نمبر کے تحت حاصل کی گئی)۔



سلیم واحد سلیم

انتساب

٭

٭

٭

اپنے چھوٹے بھائی منتظر عباس کے نام
جس نے شبابِ نوخیز کے عالم میں
ہمیں اشکبار کیا

فہرست مندرجات

باب پنجم

ضمیمہ جات

(الف) غیر مدون شعری مواد

(I) غزل

(II) نظم

(III) رباعی یا قطعہ

(ب) عکسِ تحریر

ابتدائیہ

کالرج نے کہا تھا کہ "علم کی انتہا حیرانی ہے "-(نالج اینڈز ود ونڈر) لیکن اس جملے کا مفہوم جب تک میدان تحقیق میں قدم نہ رکھا شعور کی گتھیوں کو سلجھانے میں ناکام رہا تھا- آج جبکہ سلیم واحد سلیم کے کلام کی تدوین سے عہدہ برآ ہو رہی ہوں، کالرج کا جملہ اپنی تمام تر تابانیوں، گہرائیوں اور گیرائیوں کے ساتھ ذہن کے اُفق پر واضح اور نمایاں ہوگیا ہے-سچ یہ ہے کہ تحقیق ایک طالب علم کے لئے وہ منزل اوج ہے کہ جہاں تک رسائی حاصل کرنے کے واسطے طالب علم کو اپنی توانائیاں، قوتیں، شعور و آگہی کی تمام تر دانائیوں کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے جادہ پیمائی کرنا پڑتی ہے- تب کہیں جا کر منزل مراد اس کا مقدر بنتی ہے-

میری یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ میں نے جب بھی، جس اعزاز کی خواہش کی وہ میرے دامن میں نورستہ پھول کی طرح آ گرا- علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے جب ایم-فل کے داخلے کے لئے ۱۹۹۰ءمیں درخواستیں طلب کیں تو میں نے مسز مختار سیف صاحبہ پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج بدوملہی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بلاحیل و حجت مجھے سرٹیفکیٹ جاری کر دیا، جو میں نے داخلہ فارم کے ساتھ یونیورسٹی میں بھجوا دیا-اس وقت کے صدر شعبہ اردو جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق شبلی صاحب نے انتہائی خلوص سے استعانت فرمائی- جس کے نتیجے میں، میں نے وہ تمام مراحل طے کئے جن سے گزر کر ایک طالب علم مقالہ نویسی کے مقام تک پہنچتا ہے-

مقالے کے لئے "سلیم واحد سلیم کے کلام کی تدوین" میری ذمہ داری ٹھہری- نگران پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور مقرر ہوئے لیکن اپنی عدیم الفرصتی کے باعث انہوں نے معذرت کر لی- نتیجتاً یونیورسٹی نے پروفیسر ڈاکٹر آغا سہیل صاحب کو میرا نگران مقرر کر دیا- میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہوتی رہی اور ان کی رہنمائی میں یہ مقالہ انجام پذیر ہوا- رہنمائی عالمانہ، فاصلانہ اور شفقت سے بھرپور تھی کہ فہم و ادراک صیقل ہوئے اور شعور و آگہی کو بالیدگی نصیب ہوئی- کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی زبان میرے قلم کا خاصہ نہیں پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ محترم پروفیسر ڈاکٹر آغا سہیل صاحب نے میری اس محنت کو نگاہ تحسین سے دیکھ کر میری دل دہی فرمائی-

جہاں تک مواد کے حصول کا تعلق ہے کچھ غیر مطبوعہ کلام تو لاہور ہی میں سلیم واحد سلیم کی ہمشیرہ اختر بیگم صاحبہ سے دستیاب ہوا جو آجکل قصرِ بتول کے بالمقابل شادمان لاہور میں رہائش پذیر ہیں اور دیگر غیر مطبوعہ کلام سلیم واحد سلیم کے چھوٹے فرزند مسلم سلیم صاحب کی عنایت سے مجھ تک پہنچا- یہ بھوپال (بھارت) کے رہائشی ہیں-

مقالے کی ضخامت اور جسامت اس بات کی مقتضی تھی کہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے جبکہ سلیم واحد سلیم کے کلام کا تقاضا تھا کہ مجھے دفتر درکار ہے۔ میں نے پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی صاحب صدر شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے اپنی مجبوری بیان کی تو انہوں نے ضمیمہ جات کے اضافے کا صائب مشورہ دیا۔ ورنہ یہ مقالہ یقیناً گیارہ بارہ سو صفحات پر مشتمل ہوتا۔

مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں شاعر کی سوانح حیات (مہد سے لحد تک) اور ان کا اسلوب ہے۔ جہاں تک سوانح کا تعلق ہے اس میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن زندگی کا کوئی دَور ایسا نہیں جس سے انصاف نہیں کیا گیا۔ باب دوم میں غیر مطبوعہ شاعری ہے جو غزلوں اور نظموں پر محیط ہے۔ باب سوم میں رباعیاتِ خیّام میں سے چودہ رباعیوں کا منظوم ترجمہ موجود ہے۔ لیکن سلیم واحد سلیم نے خیّام کی رباعی کا ترجمہ قطعے کی شکل میں کیا ہے۔ ۱۷۷ رباعیات کو اردو قالب میں ڈھالا گیا ہے لیکن ۱۶۳ رباعیات کو ضمیمہ الف میں اس صورت درج کیا گیا ہے کہ خیّام کی رباعی کا پہلا مصرع اور سلیم واحد سلیم کے ترجمے کا پہلا مصرع تحریر ہے۔ باب چہارم میں سلیم واحد سلیم کے وہ متفرق اشعار ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ جہاں تک باب پنجم کا تعلق ہے اس میں ضمیمہ جات شامل ہیں، یعنی سلیم واحد سلیم کی وہ غزلیں، نظمیں اور قطعات جو کسی نہ کسی مجلّے میں چھپے ہیں ان کو حوالے کے ساتھ اس مقالے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ جبکہ آخر میں عکس تحریرِ شاعر اور کتابیات درج ہیں۔

موقع کی مناسبت اور دستور کو نبھانے کے لئے یہ امر لازم ہے کہ میں اپنے ان محسنین کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے میرے اس مقالے کی تدوین و تکمیل میں اپنے مشوروں سے، اپنی مدد سے اور اپنی رہنمائی سے مجھے ڈگمگانے نہ دیا۔ ان میں محترم پروفیسر ڈاکٹر آغا سہیل صاحب، محترم پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی صاحب، محترم مسلم سلیم صاحب اور محترمہ اختر بیگم صاحبہ خصوصی طور پر میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ میں اپنے والد جناب ولایت حسین حیدری ایڈووکیٹ (جن کے دو شعری مجموعے قدم قدم کہکشاں اور حرف حرف داستاں منظر عام پر آ چکے ہیں) اپنی والدہ محترمہ مسز فردوس حیدری کی بھی ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے مجھے تعلیمی ماحول میں پروان چڑھایا اور اس مقالے میں میری دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد کی۔ مجھ پر یہ بھی واجب ہے کہ میں اپنے شریکِ حیات ڈاکٹر سید شبیر حسین (ایم-بی-بی-ایس) کی ادب دوستی کی مداح ہوتے ہوئے اس مقالے کی تدوین میں ان کی دستگیری کے لئے شکریہ ادا کروں۔

ع گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

محتشم کاشی کا شعر یوں ہے:

کردہ ام این نذرِ مولائے نجف
گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

سوانح

موت و حیات دراصل حیات انسانی کے چند مستعار لمحات کو خوشی یا غم میں گذارنے اور گذر جانے کا نام ہے ورنہ یہ بھی کوئی جینا ہے کہ دن ہفتہ بنیں، ہفتے مہینے کی شکل اختیار کریں، مہینے سال اور سال صدی کے قریب پہنچ جائیں اور ایک بھی کام ایسا نہ ہو سکے کہ جس پر "واہ" یا "آہ" کی جا سکے۔

اس مختصر سی تمہید کا نچوڑ یہ ہے کہ دنیائے ادب میں ایک ایسے نام، ایک ایسے وجود اور ایک ایسے خلوص کا تذکرہ کیا جائے جسے کچھ لوگ "سلیم واحد سلیم" کے نام سے، کچھ سودائی کے نام سے اور کچھ طبیبِ حاذق کے نام سے جانتے ہیں۔ میں نے سلیم واحد سلیم کے حالات زندگی پر سے پردہ اٹھانے کے لئے کچھ اشخاص سے ذاتی طور پر گفتگو کر کے ٹٹولا۔ ان افراد میں موصوف کے اعزاء اور ساتھیوں کا ایک گروہ ہے۔ ان حضرات سے کی گئی گفتگو کی روشنی میں حاصل شدہ نتائج سے "سلیم واحد سلیم" کے حالات زندگی کچھ اس شکل میں سامنے آتے ہیں۔

خاندان:

سلیم واحد سلیم کشمیر کے مشہور و معروف ڈار خاندان کے چشم چراغ تھے جو کشمیر پر حکمران قدیم ہندو راجگان کی عسکری قوت رہا ہے۔ (ڈار خاندان کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے محمد الدین فوق اپنی کتاب "اقوام کشمیر" کی فصل چہارم میں رقم طراز ہیں، "قدیم راجگان ہندو جب ہندو کشمیر پر متمکن تھے تو ملک کشمیر مختلف دروں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر درّے پر شیر دل آدمی مقرر کیا جاتا تھا تاکہ دشمنوں سے ملک کو محفوظ رکھ سکے۔ ڈار کا لفظ در میں سے نکلا ہے"۔ بعد میں یہ لفظ ان اشخاص کے ساتھ مختص ہو گیا کہ جو ان دروں پر مختص ہوا کرتے تھے۔ جہاں سے یہ لفظ زمانے کے حوادث کا شکار ہوتا ہوا درّہ سے ڈار بن گیا۔ اور وہ لوگ ڈار کہلائے جانے لگے جو کہ ملک کی حفاظت کے لئے ان درّوں پر متعین رہ چکے تھے۔ اس سلسلے میں فوق صاحب نے لفظ ڈار کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ سنسکرت میں درہ کو دوار اور محافظ درہ کو دوار پتی کہتے ہیں۔ نیز یہ کہ ڈار، ڈرامہ، ڈوار پتی وغیرہ الفاظ ایک ہی مصدر سے تعلق رکھتے ہیں)

کشمیر میں سلیم واحد سلیم کا خاندان، پشمینے اور ڈوری بافی کا کام کرتا تھا لوگوں کی ایک بڑی تعداد باقاعدہ طور پر اس فن کا اکتساب بھی اس خاندان سے کیا کرتی تھی۔ خاندان کے بزرگوں کو تمام لوگ احتراماً خلیفہ یعنی استاد کے نام سے پکارتے تھے یہی لفظ خلیفہ اس خاندان کے افراد کے نام کا پہلا جزو قرار پایا۔ (فوق، محمد الدین، اقوام کشمیر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۳۴ء۔ ص ۴۷)

سکھوں کے دور حکومت میں صدیق ڈار اور رمضان ڈار دو بھائی یکے بعد دیگرے کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے یہاں خداوند عالم نے انہیں عزت و آبرو بخشی اور اولاد کی نعمت سے بھی مالا مال۔ (گوہر، مسز ممتاز اختر، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۱)

اس کا مطلب ہے کہ سلیم واحد سلیم کے پردادا نے کشمیر چھوڑا اور مستقل طور پر پنجاب کے دل لاہور میں مقیم ہوئے۔ سلیم کا خاندان جس جگہ مقیم تھا وہ حویلی آج بھی محلہ چہل بیبیاں اندرون اکبری دروازہ لاہور میں

موجود ہے۔

سلیم کے دادا کا نام ''خلیفہ عبدالرحمن'' تھا۔ جو نہایت نیک دل اور متقی تھے۔ سلیم کی دادی ''رحیم بی بی'' خلیفہ عبدالرحمن کی دوسری بیوی تھیں۔ ان کے بطن سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

۱۔ خلیفہ عبدالواحد

۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

۳۔ خلیفہ عبدالغنی

۴۔ خیر النساء

۵۔ زینب النساء

۶۔ امیر النساء

۷۔ قمر النساء

''خلیفہ عبدالواحد'' اپنے تمام بھائی بہنوں میں بڑے تھے اور سلیم واحد سلیم کے والد تھے۔ انتہائی حلیم الطبع اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ اردو کے اچھے شاعر تھے۔ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور میں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔

تہران میں خلیفہ عبدالواحد ''بانک ملی ایران'' میں بطور اکاؤنٹنٹ ملازم تھے۔

یہ زمانہ خاندان قاچار کی حکومت کے آخری ایام کا زمانہ تھا۔ قاچار خاندان کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ''فخر سادات'' سے خلیفہ عبدالواحد کی شادی تہران میں طے پائی۔ جس کی اطلاع خلیفہ موصوف نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو بھی لاہور نہ دی۔ فخر سادات حافظ اور رومی کی حافظہ تھیں۔ عربی، فارسی، اور فرانسیسی زبانوں پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ ایران کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث ان کی عادات میں ویسا ہی رکھ رکھاؤ اور دھیما پن موجود تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ شیعہ اثنا عشری تھیں اور محمد و آلِ محمد ﷺ کا ذکر کرنا جزوایمان سمجھتی تھیں۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد خلیفہ عبدالولحد نے واپس لاہور آنے کا قصد کیا۔ جس میں فخر سادات کی مرضی بھی شامل تھی۔ کچھ دن کراچی میں قیام کرنے کے بعد خلیفہ عبدالواحد لاہور پہنچے اور شارع قائد اعظم (مال روڈ) پر واقع کمرشل بلڈنگ میں ایک فلیٹ لے کر فخر سادات کو وہاں آباد کیا۔ لاہور واپس آجانے کے باوجود خلیفہ عبدالواحد نے اپنی والدہ ''رحیم بی بی'' کو اس شادی کی خبر نہ ہونے دی۔ رحیم بی بی نے اپنے بیٹے کے لوٹ آنے کی خوشی میں اپنی بھانجی ''امداد بیگم'' کو بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

اکبری دروازہ لاہور کے اندرون محلہ چہل بیبیاں کی ایک حویلی میں جو شیعہ جامعہ مسجد سے متصل ہے، رسم و رواج کے مطابق امداد بیگم کی خلیفہ عبدالواحد سے شادی ہوگئی اور فخر سادات لاہور ہی میں رہنے کے باوجود اس شادی کی سن گن نہ پاسکیں۔

خالق کون و مکاں نے فخر سادات کی بجائے امداد بیگم کو پہلے اولاد کی نعمت سے مالامال کیا اور اس نومولود کا نام ''نسیم بیگم'' رکھا گیا۔ نسیم بیگم کی ولادت کے بعد خلیفہ عبدالواحد کے ایک ایرانی دوست جو ان سے ملنے محلہ چہل بیبیاں آئے ان کی زبانی امداد بیگم کو یہ معلوم ہوا کہ خلیفہ عبدالواحد پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ خلیفہ عبدالواحد نے امداد بیگم سے کہا کہ میں تمہارے اخراجات برداشت کروں گا لیکن شرط یہ ہے کہ فخر سادات کو

ہماری شادی کی اطلاع نہ ہو۔ امداد بیگم نے شرط قبول کر لی۔ لیکن بعد میں کمرشل بلڈنگ پہنچ کر فخر سادات سے لڑنا شروع کر دیا۔ اس ایک واقعے سے خلیفہ عبدالواحد، امداد بیگم سے ناراض ہوگئے اور فخر سادات کو لے کر آگرہ چلے گئے۔ آگرہ میں جوتوں کا ایک کارخانہ شروع کیا اور رہائش پیلی کوٹھی میں رکھی۔

ولادت:

پیلی کوٹھی آگرہ میں سلیم واحد سلیم ۲۴ اگست ۱۹۲۱ء کو اس کارگہہ شیشہ گری میں گریہ کناں ہوئے اور یوں اپنی زندگی کے سفر کی ابتدا کی۔ لیکن پنجاب یونیورسٹی اور نٹیل کالج لاہور کے سرٹیفکیٹ مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۲ء کے مطابق تاریخ پیدائش ۴۔ اگست ۱۹۲۱ء درج ہے۔ (راقمہ نے آگرہ جا کر بہت کوشش کی کہ سلیم واحد کی پرچی پیدائش (جنم پتری) میونسپلٹی سے مل جائے مگر معلوم ہوا کہ اول تو ۱۹۳۰ء سے پہلے کا ریکارڈ موجود نہیں اور دوسرے سوائے ہندی کے اور کسی زبان میں نقل نہیں مل سکتی)

فخر سادات نے حضرت سلیم چشتی کے نام پر اپنے فرزند کا نام سلیم رکھا۔ سلیم واحد سلیم نے خود اپنے نام کے متعلق کہا کہ:

"جب اسکول میں داخلہ لیا تو میں نے خود اپنے والد خلیفہ عبدالواحد کے نام میں سے واحد کا اضافہ سلیم کے ساتھ اپنے اس بچگانہ تصور کے تحت کیا کہ میں کم از کم اپنے باپ کا نصف تو ہوں اور جب شعر و شاعری شروع کی تو سلیم ہی تخلص رکھا نام اور تخلص کی ایسی وحدانیت قائم ہوئی کہ آج تک قائم ہے۔ میں نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں بھی اسی مضمون کو باندھا ہے:

تنہا نہیں کہ نوع بشر ساتھ ہے سلیم
مانا کہ واحد اب بھی ہیں ہم اپنے نام میں

یعنی پوری زندگی میں کسی دوسرے سلیم واحد سلیم سے ملاقات نہ ہوئی اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کا یہ نام پوری تاریخ اردو ادب میں دکھائی دیا"۔ (سلیم واحد سلیم ڈاکٹر۔ نیرنگ خیال، جدید غزل نمبر لاہور۔ ص ۳۲۶)

سلیم واحد سلیم اس گھر میں پہلا فرزند نعمت خداوند بن کر آیا۔ ان کے چار سال بعد اختر بیگم پیدا ہوئیں اور چھ سال بعد فخر سادات کی گود شمسی بیگم کی آمد سے ہری ہوئی۔

فخر سادات کی صحت آگرے میں دن بدن گرتی گئی۔ ایک دن فخر سادات نے خلیفہ عبدالواحد سے کہا کہ مجھے میری ماں کے پاس تہران بھجوا دو۔ اس پر خلیفہ عبدالواحد نے آگرے میں اپنا کاروبار ختم کیا اور فخر سادات سمیت تہران چلے گئے۔ یہ رضا شاہ کبیر کی حکومت کا دور تھا۔ انہوں نے دوبارہ بانک ملی ایران میں ملازمت کر لی۔ فخر سادات کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور کوئی تین سال کے بعد قولنج کا درد اٹھا اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ غالب خیال یہ ہے کہ فخر سادات تہران کے اس قبرستان میں دفن ہیں جہاں یگانہ روزگار جناب ابوجعفر طوسی کا مرقد ہے فخر سادات کا جنازہ شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ کے متولی عالم دین نے پڑھایا تھا۔ (اختر بیگم ہمشیرہ حقیقی سلیم واحد سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

بچپن:

سلیم واحد سلیم بچپن ہی سے من مانی کرنے کے عادی تھے۔ سارا دن لاہور کی سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ اردو بولتے ہوئے ان کا لہجہ خالص ایرانی ہوتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے زیادہ کھانے کے عادی تھے۔ اس خوش خوراکی کی بناء پر لوگ انہیں "جن" کہتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں خلیفہ عبدالواحد ایران سے لاہور آئے۔ ایک سال کے بعد امداد بیگم کو خدا نے "معین واحد" عطا کیا۔ معین کی ولادت سلیم واحد کو خاصی ناگوار گزری۔ لاہور آ کر خلیفہ عبدالواحد بے کار رہے۔ چونکہ مولانا عبدالمجید سالک صاحب سے ان کے تعلقات تھے لہذا روزنامہ "انقلاب" میں "لاہور کا جغرافیہ" کے عنوان سے کالم لکھنے لگے۔ خلیفہ عبدالواحد نظم اور نثر دونوں لکھتے تھے۔

سلیم واحد سلیم عادات میں اپنے والد کی ضد تھے۔ دوسروں کو حکم دے کر کام کروانے کے عادی تھے۔ گھر سے باہر لڑکوں سے جھگڑ کر آتے تو کپڑے پھٹے ہوتے تھے۔

تعلیم:

سلیم واحد سلیم کی ابتدائی تعلیم "مدرسہ علمیہ نوشیروان" تہران میں ہوئی۔ اور ثانوی تعلیم "دبستان شبانہ روزی زاہدان" میں مکمل ہوئی۔ لاہور آنے کے بعد خلیفہ عبدالواحد نے سلیم واحد سلیم کو ۱۹۳۷ء میں اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی میں داخل کرایا اور وہ بطور طالب علم کے باقاعدہ منشی فاضل کی جماعت میں پڑھتے رہے۔ لیکن سالانہ امتحان میں فیل ہوگئے۔ آخر ۱۹۳۹ء میں سلیم واحد سلیم نے بطور پرائیویٹ طالب علم کے منشی فاضل کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

۱۹۴۰ء میں سلیم واحد سلیم اپنے پھوپھا عطاء اللہ بٹ، پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے موصوف کو طبیہ کالج میں داخل کرا دیا۔ ۱۹۴۲ء میں موصوف نے بورڈ آف انڈین میڈیسن یو۔پی کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پاس کیا۔ اسی عرصہ میں بٹ صاحب کے کہنے پر سلیم واحد سلیم نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کا میٹرک کا امتحان دیا اور مارچ ۱۹۴۴ء میں میٹرک کی سند حاصل کی۔ اپریل ۱۹۴۴ء ہی میں موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے یونانی میڈیسن اور سرجری میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ۱۹۴۴ء کا نتیجہ جب ریکارڈ سے نکلوایا گیا تو طبیہ کالج کا نتیجہ غائب تھا۔ باوجود سید فرخ جلال صاحب کی مدد کے کامیابی نہ ہوئی)

ایران سے واپس آنے کے بعد یہ تینوں بچے یعنی سلیم واحد سلیم، اختر بیگم اور شمسی بیگم، امداد بیگم کے پاس ہی رہے۔ شروع شروع میں امداد بیگم بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ لیکن پھر ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے لگیں۔ یوں بچوں میں بھی تفریق کی خلیج بڑھتی گئی۔ محبت نے نفرت کا روپ دھار لیا۔ اس طرح وہ جنہیں ایران میں شہزادوں کی سی زندگی نصیب تھی لاہور میں محتاجوں کی سی زندگی گزارنے لگے۔ ۱۹۴۰ء تک اس پر فتن دور میں سلیم واحد سلیم نے اپنی آنکھوں سے جو جو مناظر دیکھے اور جو جو کچھ کے کھائے وہ اس کے ذہن پر غلط اثرات مرتب کرنے کے لئے کافی تھے۔ خود سلیم واحد سلیم نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا کہ:

''میں اپنے والد سمیت اپنے تمام خاندان والوں کے متعلق نہایت خراب رائے رکھتا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ رائے اب بھی رکھتا ہوں کیونکہ میری زندگی کے بعد کے تجربات نے میری رائے کو پختہ سے پختہ تر کیا''۔(ادبی دنیا، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء)

ملازمت:

۲۶۔ مئی ۱۹۴۶ء کو سلیم واحد سلیم، مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج ہسپتال علی گڑھ میں بطور ہاؤس فزیشن پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم ہوئے۔ وہ ایک سال اور چار مہینے طبیہ کالج ہسپتال میں ہاؤس سرجن رہے۔ طبیہ کالج علی گڑھ سے ملازمت چھوڑنے کے بعد سلیم واحد سلیم سہارنپور طبیہ کالج میں بطور پرنسپل آئے اور ایک سال تک وہاں تعینات رہے۔ ۱۹۴۸ء میں سہارنپور سے مظفر نگر شعبہ انسداد امراض متعدی کے ہسپتال میں ان کی تبدیلی ہو گئی۔ وہ چھ، سات سال اس ہسپتال میں تعینات رہے۔

شادی:

۱۹۴۶ء میں سلیم واحد سلیم کی شادی ''ام حبیبہ'' سے طے پائی اور اس کی اطلاع خلیفہ عبدالواحد اور امداد بیگم کو سلیم کی پھوپھی امیر النساء نے بھجوائی تھی۔ سلیم واحد کی برات علی گڑھ کے محلے ''قاضی پاڑا'' میں گئی۔ بیگم جمیلہ رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ وہ بھی اس شادی میں شامل تھیں۔(بیگم جمیلہ رشید احمد صدیقی سے علی گڑھ میں راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان) یہ ام حبیبہ کی دوسری شادی تھی۔(نسیم بیگم ہمشیرہ سلیم واحد سلیم سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

ام حبیبہ سید عبدالاحد کی چھوٹی بیٹی تھیں، جو حیات ہیں۔ سید عبدالاحد نواب حمید اللہ خان آف بھوپال کے سیکرٹری تھے۔ سید عبدالاحد کے والد سید عبدالباقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ سید عبدالاحد کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ صرف دو بیٹیاں تھیں۔ ام حبیبہ کی بڑی بہن کا نام عائشہ خاتون ہے۔ان کی شادی خواجہ محمد مسعود صاحب سے ہوئی۔ اور آجکل بھی وہ محلہ قاضی پاڑا میں رہائش پذیر ہیں۔

عائشہ خاتون نے بتایا کہ ام حبیبہ قرآن مجید پڑھ سکتی ہے اور ٹوٹی پھوٹی اردو بھی لکھ سکتی ہے۔ وہ کبھی اسکول میں باقاعدہ داخل نہیں ہوئی۔ ام حبیبہ کی پہلی شادی اپنے اعزا میں ہوئی تھی لیکن تین ماہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکی اور طلاق ہو گئی۔(عائشہ خاتون سے بمقام قاضی پاڑا علی گڑھ میں راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

۱۹۴۷ء میں خداوند عالم نے ام حبیبہ کو خالد سلیم عطا کیا۔ خالد سلیم اپنے والد کے ساتھ سہارنپور اور مظفر نگر بھی رہا۔ خالد سلیم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پولی ٹیکنیک میں ڈپلومہ حاصل کیا اور آجکل اوتکار کمپلیکس بھوپال میں ملازم ہے۔(عائشہ خاتون سے بمقام قاضی پاڑا علی گڑھ میں راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

علمی و ادبی سرگرمیاں:

سلیم واحد سلیم چونکہ شاعر تھے لہذا علی گڑھ کی تمام ادبی سر گرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں فارسی کی ترکیبیں بڑی آزادی اور روانی سے استعمال کرتے تھے۔

سلیم واحد سلیم اور ام حبیبہ میں ذہنی مطابقت نہ تھی کہ ایک درویش منش اور خود دار تھا اور دوسری خود غرض اور دنیا دار، پھر بھی ۱۹۴۹ء تک یہ گاڑی کسی نہ کسی طور چلتی رہی۔ آخر ایک دن سلیم واحد سلیم نے پاکستان منتقل ہونے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ جو ان کے سسرال والوں کو قطعی طور پر پسند نہ آیا اور انہوں نے ام حبیبہ کو سلیم کے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ یوں سلیم برصغیر کی تقسیم کی طرح تقسیم ہو کر پاکستان آگئے اور ان کی بیگم اور بچہ ہندوستان میں رہ گئے اور ایک کمسن بچے کو باپ کی شفقت سے محروم کر دیا گیا۔

جن دنوں سلیم واحد سلیم پاکستان پہنچے، خلیفہ عبدالواحد اپنی بیگم اور دونوں بچوں سمیت سیالکوٹ میں رہائش رکھتے تھے۔ یہاں سیالکوٹ ہی میں سلیم واحد سلیم نے اپنا مطب بھی کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ام حبیبہ، خالد سلیم کو لے کر پاکستان آئیں اور سیالکوٹ میں چند ماہ رہیں لیکن ام حبیبہ اور سلیم واحد سلیم کے تعلقات خوشگوار نہ ہو سکے اور آخر کار ام حبیبہ، سلیم واحد سلیم کو واپس ہندوستان لے جانے میں کامیاب نہ ہوئیں تو خالد سلیم کو لے کر میکے چلی گئیں۔ پاکستان سے واپس جانے کے بعد ام حبیبہ پہلے علی گڑھ گئیں۔ پھر اپنے قصبے شاہ آباد ضلع ہردوئی چلی گئیں جہاں ۱۹۵۰ء کی آخری سہ ماہی میں مسلم سلیم کی ولادت ہوئی۔

(مسلم سلیم نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کیا اور آجکل بھوپال کے ایک انگریزی اخبار "بھاسکر" میں سب ایڈیٹر کے طور پر ملازم ہیں)

۱۹۵۰ء ہی میں سلیم واحد سلیم ایک بار پھر ہندوستان گئے تاکہ اپنے اہل و عیال کو پاکستان آنے راضی کر سکیں۔ لیکن ان کے سسرال نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ ۱۹۵۱ء میں سلیم واحد سلیم ہندوستان سے واپس پاکستان لوٹے تو پھر ان کی دوبارہ اہل و عیال سے ملاقات کی کوئی سبیل نہ بن سکی۔ موصوف نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں اس کا تذکرہ کیا ہے جو ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ قلمبند کی گئی۔

(زندگی کا یہ حال ہے کہ دس سال سے اپنی بیوی بچوں سے بچھڑا ہوا ہوں اور ان کی صورت تک نہیں دیکھی)

۱۹۵۲-۵۳ء میں سلیم واحد سلیم لندن گئے اور دو سال برطانیہ میں قیام کرنے کے بعد واپس لاہور لوٹ آئے۔ یورپ میں موصوف نے مختلف شہروں کے متعلق نظمیں بھی لکھیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد سلیم واحد سلیم نے بازار سمیاں اندرون ٹکسالی دروازہ لاہور میں اپنا مطب کھولا اور طبابت شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ادبی ماہنامہ "دستور" لاہور کے مدیر اعزازی بھی مقرر ہوئے۔

سیاسی و نیم سیاسی سر گرمیاں:

۵-اکتوبر ۱۹۵۷ء کو سلیم واحد سلیم نے سول سیکر ٹریٹ کے سامنے رابرٹ کلب کے بالمقابل بھوک ہڑتال شروع کر دی اور ۱۶-اکتوبر ۱۹۵۷ء تک بھوک ہڑتال جاری رہی اور اس بھوک ہڑتال کی خبریں لاہور کے مختلف روزناموں میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔

("۶-اکتوبر ۱۹۵۷ء کے "نوائے وقت" میں درج ذیل خبر شائع ہوئی"

"سیکرٹریٹ کے سامنے ڈاکٹر کی بھوک ہڑتال:

(سٹاف رپورٹر) لاہور ۱۶- اکتوبر صوبائی سیکرٹریٹ کے سامنے ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے کل صبح سے اس بنا پر بھوک ہڑتال کر رکھی ہے کہ سی-آئی-ڈی کے ارکان انہیں بلاوجہ پریشان کرتے ہیں-

۲-۱۶-اکتوبر ۱۹۵۷ء کے روزنامہ "آفاق" لاہور میں یہ خبر شائع ہوئی-

"سی-آئی-ڈی کے رویہ کے خلاف ہڑتال"

لاہور-۵-اکتوبر (سٹاف رپورٹر) ملک کے معروف ادیب ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے سی-آئی-ڈی کے رویے سے تنگ آ کر احتجاجاً سیکرٹریٹ مغربی پاکستان کے سامنے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے- اس وقت تک انہیں اس حالت میں ۳۸ گھنٹے گذر چکے ہیں-

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کا کہنا ہے کہ سی-آئی-ڈی ایک عرصہ سے تنگ کر رہی ہے اور انہیں قائد ملت لیاقت علی خاں مرحوم کی شہادت کے سلسلے میں بعض افراد کے خلاف شہادت دینے پر مجبور کر رہی ہے- حالانکہ کسی وقت میں ان کا کسی سیاسی یا غیر سیاسی پارٹی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا-

۱۵اکتوبر ۱۹۵۷ء کے روزنامہ "کوہستان" میں درج ذیل خبر چھپی:

"ڈاکٹر سلیم واحد کی بھوک ہڑتال دسویں دن بھی جاری رہی"

لاہور (سٹاف رپورٹر) ۱۴ اکتوبر-ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کی بھوک ہڑتال دسویں روز بھی جاری رہی- اور اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی- ڈاکٹر صاحب کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے لکن حکومت کی طرف سے تاحال کسی معالج کو ان کا طبی معائنہ کرنے کے لئے متعین نہیں کیا گیا- ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے سی-آئی-ڈی کے قابل اعتراض رویے کے خلاف بطور احتجاج سول سیکرٹریٹ کے سامنے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے-

۱۶-اکتوبر کو ۱۱ روز کے بعد سلیم واحد نے حکومت کی یقین دہانی کے بعد بھوک ہڑتال ختم کر دی)-

علالت:

زمانے کی سرد مہری اور خفیہ پولیس کی مہربانیوں کے باعث سلیم واحد سلیم ذہنی طور پر خوفزدہ رہنے لگے- لیکن یورپ سے واپسی اور بھوک ہڑتال تک وہ ذہنی طور پر تندرست تھے- تخلیق کا عمل بالکل درست اور تحریر شگفتہ تھی- چونکہ موصوف انتہائی حساس انسان تھے اور انکی تقریباً تمام زندگی تضادات کا شکار رہی یعنی بچپن میں حقیقی ماں کے پیار سے محرومی، سوتیلی ماں کے کچوکے، لڑکپن میں والد کی بے توجہی، ماحول کی ناسازی، ناموزوں شادی، سسرال کی ہٹ دھرمی، اولاد سے جدائی، دوستوں کی بے مہری، ذرائع آمدنی کی کمی، عزیزوں کا ناروا سلوک یہ سب باتیں ایسی تھیں جنھوں نے سلیم واحد سلیم کو نفسیات کی اصطلاح میں "پیرانایا" کا مریض بنا دیا- (پیرانایا کا مریض بظاہر ہر لحاظ سے متوازن ہوتا ہے اور جس موضوع پر بھی اس سے گفتگو کی جائے وہ انتہائی باشعور ہونے کا ثبوت دیتا ہے- لیکن ایسا انسان اپنے گرد خیال کا ایک مخصوص دائرہ بنا لیتا ہے کہ کوئی دوسرا اس میں داخل نہیں ہو سکتا)-

سلیم واحد سلیم کو دو مرتبہ ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کرایا گیا- اپنے پاگل پن کے بارے میں سلیم واحد سلیم لکھتے ہیں:

"پہلی مرتبہ مجھے پاگل خانے میں داخل کرایا گیا تو میں سویا ہوا تھا۔ پاگل خانے کے عملے کو گھر بلا کر مجھے رسیوں سے جکڑا گیا اور پاگل خانے لے جایا گیا۔ دوسری مرتبہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی عمل روا رکھا گیا۔ جب پاگل خانے سے باہر آیا تو انٹیلی جینس اور خفیہ اداروں کے گماشتے مجھے پریشان کرنے لگے۔ اب دیکھو نا! کہ میں ارسٹوکریٹ گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہمارے ہاں صبح ناشتہ کی میز پر مکھن، ٹوسٹ، چھری کانٹوں سے سجائی جاتی ہے لیکن میرے ناشتے میں لسی کا گلاس اور گھی کا پراٹھا، گھٹیا قسم کی چنگیروں میں کھانے کو دیا جاتا ہے۔ جو میں اٹھا کر پھینک دیتا ہوں کہ آخر دیگر افراد خانہ کی طرح مجھے ناشتہ کیوں نہیں دیا جاتا۔ تو یہ کہتے ہیں کہ "پاگل ہو گیا ہے"۔ (کنول فیروز صاحب سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

سلیم واحد سلیم ہر شخص کو سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی سمجھتے تھے کہ انکی طبعیت میں شکوک و شبہات مکمل طور پر جاگزیں ہو چکے تھے وہ اپنی زبان میں ایسے آدمی کو خفیہ کا آدمی کہتے تھے۔ اس بیماری کو "سیزوفرینیا" کہتے ہیں۔ (ڈاکٹر محمد رشید چوہدری صاحب سے فاؤنٹین ہاؤس لاہور میں راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی وساطت سے مجلس ترقی ادب لاہور نے "تزک جہانگیری" کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لئے ڈاکٹر خلیفہ سلیم واحد سلیم کا انتخاب کیا اور انہوں نے پیرانایا اور سیزوفرینیا کا مریض ہونے کے باوجود نہایت بامحاورہ اور شستہ ترجمہ کر کے اپنی زبان دانی اور ذہانت کا عملی طور پر ثبوت فراہم کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء میں "ادبی دنیا" نے کشمیر نمبر شائع کیا تو اس میں سلیم واحد سلیم نے کئی نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں آج بھی اپنے خالق کے استاد ہونے پر دال ہیں۔

دمِ واپسیں:

آخری بار سلیم واحد سلیم کو ان کے بہنوئی ملک نذیر احمد نے دماغی امراض کے ہسپتال میں مورخہ ۸۔ جنوری ۱۹۸۱ء کو داخل کرایا۔ لیکن ۱۹۔ فروری ۱۹۸۱ء کو کل نفسٍ ذائقۃ الموت کے مصداق ڈاکٹر خلیفہ سلیم واحد سلیم نے علی الصبح داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ملک نذیر احمد نے مرحوم کو قبرستان شیر شاہ لاہور میں سپرد خاک کیا۔

سلیم واحد سلیم کے انتقال کی خبر بھارت کے اخبار روزنامہ آفتاب جدید بھوپال میں یکم اپریل کو کچھ یوں شائع ہوئی:

"منفرد اور کہنہ مشق شاعر ڈاکٹر خلیفہ سلیم واحد کا انتقال"

بھوپال ۳۱۔ مارچ آفتاب کے جدید رفیق کار مسلم سلیم کے والد محترم ڈاکٹر سلیم واحد کا لاہور (پاکستان) میں انتقال ہو گیا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔

سلیم واحد سلیم ایک کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر تھے نیز سات زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ حال ہی میں انہوں نے کئی منظوم تراجم مکمل کئے تھے۔

تزک جہانگیری کا ترجمہ بھی جن میں شامل ہے"۔

سلیم واحد سلیم کے انتقال پر مختلف ادبی شخصیات نے بھی مضامین لکھے جو اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے۔

جناب مصطفےٰ کمال پاشا نے "ایک مجذوب شاعر" کے عنوان سے مضمون لکھا جو روزنامہ امروز ہفت روزہ اشاعت میں یکم مئی ۱۹۸۱ء کو شائع ہوا۔

جناب ستار طاہر نے "سڑکوں اور باغوں کا باسی" کے عنوان سے مضمون لکھا جو روزنامہ امروز لاہور میں ۸- مئی ۱۹۸۱ء کو شائع ہوا۔ بعد میں انہوں نے یہ مضمون اپنے کالموں کے انتخاب "حلقہ دام خیال" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کروادیا۔

جناب عارف عزیز نے "ادب کا ایک خاموش خدمت گار۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم" کے عنوان سے مضمون لکھا جو روزنامہ "آفتاب جدید" بھوپال سنڈے ایڈیشن میں مورخہ ۲۲-اگست ۱۹۸۲ء کو شائع ہوا۔

روزنامہ آفتاب جدید بھوپال میں ۷- ستمبر ۱۹۸۲ء کو "ایک گمنام ادبی شخصیت کا تعارف" کے عنوان سے ظفر عالم کا ایک خط بھی شائع ہوا۔

سلیم واحد سلیم نے اس دنیا سے اٹھ جانے کے باوجود اپنے آپ کو، اپنے نام کو، اپنے کام کو، جریدۂ عالم پر کچھ اس طرح سے ثبت کردیا ہے کہ دنیا کی پائیداری بھی ان کے لہورنگ کو گرد آلود کرنے سے عاجز ہے۔

شخصیت

سلیم واحد سلیم کی شخصیت نہ تو مردم آزار تھی اور نہ ہی حاکم و جابر۔ وہ اپنے کردار کے اعتبار سے انتہائی منفرد اور عزت و وجاہت کے مقام پر فائز تھے۔ ان کی ذات زمانے کی چیرہ دستیوں اور ناقدری کی سختیوں کے باعث ایک ایسے بھولے بھالے انسان کی نمائندگی کرتی ہے جیسے دو میٹھے بول گرویدہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ سلیم کو باپ کی طرف سے ایک کشمیری گھرانے کے چشم و چراغ اور ماں کی جانب سے ایران کے شاہی خاندان کے فرزند ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو کسی کے آگے جھکتے تھے اور نہ ہی اپنی خاندانی وجاہت کو بٹہ لگنے دیتے تھے۔

شکل و صورت اور لباس:

سلیم واحد سلیم شکل و صورت کے اعتبار سے پر کشش اور بارعب تھے۔ رنگ سرخ و سفید، ناک ستواں، لب باریک، آنکھیں گویا چشم آہو، پیشانی کشادہ، قدم اور جسم موٹا مگر موزوں کہ موٹاپے کا گمان تک نہ ہو۔ پہلی ملاقات ہی میں وہ مدمقابل پر انمٹ تاثر چھوڑتے تھے۔ سلیم واحد ہمشیہ کوٹ پتلون اور ٹائی پہنتے تھے سر پر فلیٹ ہیٹ ہوتا تھا اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا جوتا۔ وہ انتہائی صاف ستھرا لباس پسند کرتے تھے۔

عادات و خصائل:

سلیم بہت بااخلاق، انتہائی شریف اور وضع دار تھے۔ سلیم واحد کو بچپن ہی سے لگی لپٹی رکھے بغیر حق گوئی کی عادت تھی۔ منافقت ان کی سرشت میں داخل نہ تھی۔ وہ نہ کسی سے ڈرتے تھے نہ کسی کے آگے جھکتے تھے وہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے تھے۔

سلیم واحد سلیم ادب و آداب کے بہت قائل تھے۔ اور کسی بے اصولی کو برداشت نہ کرتے تھے۔ اگر کوئی وعدہ کر کے اسے پورا نہ کرتا تو اس کے سخت مخالف ہو جاتے تھے وہ تحقیقی و منطقی ذہن کے مالک تھے۔ اک شان بے نیازی ان میں پائی جاتی تھی جو آخری دم تک قائم رہی۔

سلیم بہت جذباتی اور حساس تھے۔ اور کمال کے دوست ثابت ہوتے تھے وقت کی پابندی کا عالم یہ تھا کہ جناب انجم رومانی نے ایک نظم کہی جس کا ایک شعر یہ تھا:

آتا ہے ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر سلیم (صبح)
جاتا ہے ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر سلیم (شام)

(شہرت بخاری صاحب سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

سلیم واحد سلیم مسلسل اور انتھک گفتگو کرتے تھے جو رات بھر جاری رہتی تھی اور وہ یہ خواہش رکھتے تھے

کہ ان کو ہی سنا جائے۔(حبیب جالب صاحب مرحوم سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

سلیم واحد سلیم کو بچپن ہی سے اپنی بات منوانے کی عادت تھی۔ اور جوانی میں تو انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی انہیں جواب تک دے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں بات کرنے کا ڈھنگ خوب آتا تھا جس سے سننے والے مسحور ہو جاتے تھے۔

وہ بہت عالی دماغ اور عالی حوصلہ تھے۔ انتہائی معاملہ فہم اور اپنے دور کے علمی دیو تھے۔(عارف عبدالمتین صاحب سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

خوراک:

خوراک کے معاملے میں سلیم واحد سلیم بہت بسیار خور تھے۔ لیکن کوئی خاص چیز انہیں پسند نہ تھی۔درجن بھر روٹیاں ایک ہی وقت کھا کر بھی ڈکار نہ لیتے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ کسی کو دعوت طعام بھی نہیں دیتے تھے۔موصوف نے خود اپنی بسیار خوری کے بارے میں اپنے شکم کو "تنور شکم" کہا ہے۔

سلیم واحد سلیم بہت ٹھنڈا پانی پیتے تھے۔ایرانی ہونے کے ناطے جب تک وہ ٹھنڈے پانی کو بہت ٹھنڈا نہ کر لیتے نہ پیتے تھے۔

شاعری:

سلیم واحد سلیم سخن فہم، سخن نواز اور سخن ور تھے۔ غزل کلاسیکی رنگ میں کہتے تھے اور بہت اچھی کہتے تھے۔حلقہ ارباب ذوق میں شعروں پر تنقید کرتے ہوئے اچھے نکات اٹھاتے تھے۔ان کے اٹھائے ہوئے نکات میں بصیرت فکر، دقت نظر اور ذوق سلیم بدرجہ اتم موجود ہوتا تھا۔غزل تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ انہیں اپنے کلام پر بڑا ناز تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ادبی رسالے میں نہیں چھپے۔

سلیم واحد سلیم بحیثیت شاعر کے کبھی غیر متوازن نہیں ہوئے۔ ان کا تخلیقی عمل بہت جاندار تھا۔ جب بھی وہ اپنی غزل چھپنے کو دیتے تھے تو وہ تازہ ہوتی تھی۔ سلیم واحد سلیم اردو میں غالب کو اور فارسی میں خیام اور حافظ کو بہت پسند کرتے تھے۔

وہ غزل گوئی میں روایت کے قائل تھے۔ لیکن ان کی نظموں میں جدت نظر آتی ہے۔وہ دوسروں کے شعروں پر بہت کم داد دیتے تھے۔ یا تو داد دینے میں بخیل تھے یا کسی کو داد کے قابل نہ سمجھتے تھے۔(پروفیسر مظفر بخاری صاحب سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

سلیم واحد سلیم نے ایک مرتبہ اپنے سامعین میں سے مصطفےٰ کمال پاشا سے کہا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب اپنے وقت میں غالب تھے اور ہم اپنے وقت پر غالب ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی شاعرانہ عظمت کا اپنے ساتھیوں سے لوہا منوایا۔وہ مشاعرں میں باقاعدگی سے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ لاء کالج کے ہال میں مشاعرہ تھا۔ یہاں سلیم واحد سلیم نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع تھا:

مل جائیں گے تم کو چاہ والے

ڈھونڈو گے لیکن نباہ والے

سامعین نے اس پوری غزل پر دل کھول کر داد دی۔(یونس جاوید سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)
ایک مرتبہ ایم-اے-او کالج لاہور کے مشاعرہ میں سلیم واحد سلیم نے اپنی غزل سے ایسا سماں پیدا کیا کہ پورا مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس غزل کا مطلع یہ تھا:

سارے جہاں کی مستیاں ہیں چشم یار میں
سارے جہاں کی خوبیاں ہیں چشم یار میں

ایک مرتبہ سلیم واحد سلیم نے ازراہ مزاح اپنے چچا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے کہا کہ:
"میں اپنے شعروں اور اپنی نثر میں بنی نوع انسان کو جو پیغام دے رہا ہوں اگر اس میں کامیاب ہو گیا تو آپ کو اور آپ کے نام کو اپنی گرد میں چھوڑ جاؤں گا"۔(ادبی دنیا ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۹۸)

مذہب:

سلیم واحد سلیم کی والدہ ایرانی النسل تھیں اور عقیدے کے اعتبار سے شیعہ امامیہ اثنا عشری تھیں۔ سلیم لاہور آکر باقاعدگی سے عزاداری کے جلوسوں میں شرکت کرتے تھے اور سینہ کوبی بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے چچا عبدالغنی نے انہیں محرم کے جلوس میں سینہ کوبی کرتے ہوئے دیکھا تو گھر آکر کہا کہ یہ تو شیعہ ہے۔(نسیم بیگم سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

وہ کہا کرتے تھے کہ اگر ایمان کی پختگی دیکھنی ہو تو شیعہ اثنا عشری مسلمانوں کو دیکھو کہ وہ ہر کسی سے منہ موڑ سکتے ہیں مگر محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متمسک رہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اصل میں پنجتن پاک کی محبت ہی انسانیت کی بقاء کی ضامن ہے۔ انہیں تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی محبت گھٹی میں ملی تھی۔

موصوف نے ایک مرتبہ اپنی بہن سے کہا کہ کبھی کبھی میرے ذہن میں آتا ہے کہ خدا کا وجود نہیں ہے لیکن جب میری نگاہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی جانب اٹھتی ہے تو بے اختیار ان کا تذکرہ کرنے اور جس صبر واستقامت سے انہوں نے باغی اور طاغی قوتوں کا مقابلہ کیا ہے، اسے نظم کرنے کے لئے ذہن تیار ہو جاتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں خدا کا منکر نہیں ہوں۔ میں عظمت حسین علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ ان کی شان میں میرا کلام مجھ پر آمد بن کر آتا ہے۔ میری کوشش کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

مشاغل:

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کو کسی کھیل سے رغبت نہ تھی۔ وہ ذہنی طور پر پڑھنے پڑھانے والے آدمی تھے۔ ہر وقت ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ موجود رہتا تھا۔ ادبی محفلوں میں بیٹھنا اور مشاعروں میں شرکت کرنا ان کی عادت تھی۔ ادبی محفلوں میں گفتگو کرتے ہوئے وہ شاعر سے زیادہ فلسفی لگتے تھے۔(انجم رومانی صاحب سے

راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان)

افکار و نظریات:

سلیم واحد سلیم معاشرے کی برائیوں اور اونچ نیچ کے مخالف تھے۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس معاشی نظام کو برا کہتے تھے جو غریب اور امیر کی تقسیم، جاگیر دار اور مزارع کی تفریق کرتا ہوا انسانیت کو گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ نظریاتی طور پر عدل و انصاف، حق گوئی، بے باکی، حق پسندی اور حق پرستی کے قائل تھے۔ وہ اسلام کے اس نظام مساوات و مواخات کے قائل تھے جس کی داغ بیل اس صفحۂ ہستی پر سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈالی تھی۔

سلیم واحد سلیم وحدت انسانی کے اشتراک کے علمبردار تھے۔ اسلام کے اصولوں کو پسند کرتے تھے۔ وہ کسی پر میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اپنے واضح نظریات کے باعث دکھوں بھری اس دنیا میں سکھ کے سانس کی بات کرتے تھے۔

بری عادات:

موصوف ضدی، ہٹ دھرم اور اپنی بات منوانے کے عادی تھے۔ وہ اپنی ذات یا اپنی تخلیقات پر بہت کم تنقید برداشت کرتے تھے۔ لیکن دوسروں پر اور ان کی تخلیقات پر تنقید ان کا من بھاتا کھاجا تھا۔

سلیم واحد دشنام طرازی روزمرہ کے طور پر کرتے تھے۔ کبھی یہ گالی فارسی میں ہوتی تھی کبھی اردو میں۔ وہ آثار آشفتگی کے بعد شکی المزاج اور شکی الذہن ہوگئے تھے۔ وہ اپنے سے برتر کسی کو نہ سمجھتے تھے۔

آشفتہ سری اور وفات:

سلیم واحد سلیم بچپن ہی سے کچھ ایسا نصیب لے کر آئے تھے کہ ماں کی مامتا سے محروم ہوگئے۔ باپ کی شفقت دوری کے باعث سایہ فگن نہ ہو سکی، سوتیلی والدہ نے کچوکے لگائے، حقوق تلف ہوئے، دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں، ازدواجی زندگی اجیرن ہوئی، اولاد کے پیار سے محروم ہوئے، بدحالی نے گھر دیکھا، دوستوں نے وفا نہ کی، حکومت نے زیادتیاں کیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صحت مند ذہن بگڑ گیا۔ ایک خوش اخلاق انسان دشنام طراز ہوگیا اور ایک اعلیٰ خاندان کا خوبصورت چشم و چراغ کس مپرسی کے عالم میں زیر زمین گمنامیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو گیا۔

ایسے وقت میں کہ جب سلیم واحد سلیم کا سایہ بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکا تھا، اعزا اور دوستوں کا گلہ کیا۔ انہوں نے راہی ملک عدم کو سدھارتے ہوئے خالق حقیقی کے امر پر لبیک کہتے ہوئے مینٹل ہسپتال میں اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کردی۔

اَجل پہ تُف ہے کہ ایسے گہر بھی ہوں تہہ خاک
کہ جن سے زیست چمک مستعار لیتی ہے

اسلوب

شاعری جزویست از پیغمبری کے مصداق شاعر خداداد صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا حسّاس فرد ہوتا ہے جو دنیا میں رونما ہونے والے ہر تغیرو تبدل کو یوں محسوس کرتا ہے جیسے سب کچھ اس کی ذات پر بیت رہا ہو۔ سلیم واحد سلیم نے ایک حسّاس دل پایا تھا کہ جو نباتات و جمادات میں بھی وہی نزاکت و جذبات ڈھونڈتا تھا جو انسان کے دل میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک ندرتِ مضامین کا تعلق ہے سلیم واحد سلیم نے غالب سے استفادہ کیا ہے اور جہاں انسانی تڑپ اور انقلابی روح کا واسطہ ہے وہاں اقبال ان کے رہنما دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے ندرتِ مضامین کو انقلاب آفرین جذبوں میں سمو کر اپنے کلام کو انفرادیت سے ہمکنار کردیا ہے۔

سلیم واحد سلیم شاعری میں روایت پسند ہیں کیونکہ انہوں نے ایک تو روایت کے سلسلے کو قائم رکھا یعنی فارسی شاعری کے سانچے، بحور، موضوعات اور اسالیب کو اپنایا، دوسرے جدید دور کے میلانات کو شامل کر کے ایک حسین امتزاج پیش کیا۔ انہوں نے مضامین حسن و عشق کو ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کے عشقیہ اشعار میں تنوع، جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے۔ اجتہاد کے پہلو بہ پہلو روایت کی پاسداری ان کی عشقیہ شاعری میں واضح طور پر قائم ہے۔

جہاں جہاں غمِ دوراں نے لی ہے انگڑائی
وہاں وہاں ترے انداز ہم کو یاد آئے

کچھ اور بھی آئے وہ سلیم آج سوا یاد
چھیڑا ہے جو غنچوں کو نسیمِ سحری نے

ہزار ادائیں ہر اک دل نشیں و مہر آگیں
بتائیں کیا ہمیں کس کس ادا پہ پیار آیا

شفق کے رنگ میں خوشبوئے زلفِ یار تو ہے
اگر چمن میں نہیں ہے کہیں بہار تو ہے

تو ساتھ ہے تو غیرتِ فردوس ہے چمن
جنّت ترے بغیر اگر ہے سراب ہے

جب ان کو پیار سا آئے ہماری وحشت پر

تو کس لئے ہمیں اپنے جنوں سے پیار نہ ہو

عشق مجازی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں عشق حقیقی کے بھی جلوے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ توحید وجودی کے اتنی شدت سے قائل نظر آتے ہیں کہ شاہد و مشہود میں موجود تعلق بھی انہیں اعتباری و موہوم نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک شاہد و مشہود اور شہود سب ایک ہیں۔

تو ہی پابند نگاہِ امتیاز آلود ہے
ایک ہی ورنہ شہود و شاہد و مشہود ہے

وہ محبوب حقیقی کی عبادت میں بندے کی سراپا نیاز مندی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

لطف سجدہ تو سراپا سجدہ بن جانے میں ہے
سر سے پا تک سجدہ بن سجدہ جبیں تک ہی نہیں

نماز تو ہے سراپا نیاز ہو جانا
بجز نیاز مکمل تری نماز نہیں

سلیم واحد سلیم نے اپنے زمانے کے حالات اور سیاسی و سماجی شعور کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی اور ساتھ ساتھ اردو شاعری کی روایت کو بھی قائم رکھا۔ یوں ان کا کلام قدیم و جدید کا حسین امتزاج بن کر سامنے آیا۔ ان کی شاعری میں سماجی ناانصافیوں اور انسان کی محرومیوں نے خاصی جگہ پائی ہے۔ وہ طبقاتی تقسیم سے نالاں ہیں۔ وہ ہر کمزور پر ظلم کرنے والے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور سامراجیت کے گھناؤنے عزائم کو بے نقاب کرتے ہیں۔

پابہ جولاں ہے اب تک یہ ستم کش مزدور
آج بھی کشتۂ صد جور وجفا ہے اے دوست

سلیم اب شہر کے رکھوالے جتنے ہیں نرالے ہیں
کہ جتنی بار بھی لوٹا غریبوں کا نگر لوٹا

لوٹ لی انسان نے انسانیت کی آبرو
ورنہ انسانی لبوں پر کشت و خوں کی داستاں

کب تک ریاکار و اعتمادِ مکاری
چاک ہو ہی جاتا ہے پردۂ ریاکاری

شاعر صرف خود ہی علم بغاوت بلند نہیں کرتا بلکہ تمام بنی نوع انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ظلم کے خلاف جہاد کرے۔ وہ معاشرتی ناانصافیوں اور جور وستم کے برعکس انقلاب لانا چاہتا ہے۔ یہ انقلاب طبقاتی تقسیم ، سرمایہ داری، سامراجیت اور ظلم و ستم کو زمین بوس کر کے ایک نئے نظام کا پیامبر بنے گا۔

جلا کے اک روز خاک کردے گا قصر شاہی کے بام و در کو
یہ شعلۂ سرکشی جو پنہاں ہماری جانِ نزار میں ہے

ہم اہل دنیا کی حاسدانہ قیود کو توڑ توڑ دیں گے
مرے ارادوں کی ڈھال لے لو میرے قدم سے قدم ملاؤ

غرورِ حکم، فریب پیہم، سرشتِ سرمایہ دار میں ہے
علاج اس شیطنت کا محنت کشوں کے بھرپور وار میں ہے

سلیم واحد سلیم کی شاعری میں غم کے ساتھ ساتھ رجائی انداز بھی ملتا ہے۔ وہ غم میں خوشی تلاش کرنے کو زندگی کا نام دیتے ہیں۔

ہر صدمۂ جاں گُسل سے گزرے ہم
ہر غم میں خوشی سمو گئے ہم

دنیا میں رنج و غم سے کسے مل سکی نجات
لیکن خوشی خوشی سے بسر کر سکے تو کر

سلیم واحد سلیم بنیادی طور پر فلسفیانہ مزاج کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام پر تعقل اور تفکر کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ غموں کے ساتھ ٹکرانے کا انداز ملتا ہے۔ چیزوں کے بارے میں سوچ کا گہرا عنصر موجود ہے۔ ایسا شاعر کائنات، انسان اور خالق کائنات یعنی خدا کے رشتوں کی تلاش کرتا ہے پھر اپنی ذات کا کھوج لگاتا ہے۔ ان کے ہاں ذات اور انا کا ٹکراؤ اور انسانی انا سے فطرت اور کائنات کا ٹکراؤ ملتا ہے۔ شاعر انسان کا، کائنات میں مقام تلاش کرتا ہے۔ وہ کائنات کے بارے میں ازلی و ابدلی سوالات اور آسمانی مخلوق اور زمینی مخلوق کے خالق کی تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

حیات و موت کے معموں میں ذہن الجھا ہوا ہے لیکن
حیات کیا ہے؟ ممات کیا ہے؟ یہ راز کیسے سمجھ میں آئے

آ کہ سارے جہاں پہ چھا جائیں
آ کہ تسخیرِ کائنات کریں

ایک نظم میں کہتے ہیں:

زمین ہے ایک سیارہ جہاں سے ابتداء کی تھی
اور ان افلاک کے تاروں سے اپنی ابتدائے نو کریں گے ہم

سلیم واحد سلیم نے جب محسوس کیا کہ انسان فطرت سے دور ہوتے جا رہے ہیں تو انھوں نے اپنے کلام میں فطرت کو نزدیک تر کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فطرت کو مختلف سطحوں پر استعمال کیا ہے۔ مظاہر فطرت، فطرت کا انسانی حُسن سے تعلق اور فطرت کے ذریعے معاشرتی آشوب کا بیان ان کے کلام میں موجود ہے۔

تیرا جلوہ ہے خنک اوس چمن میں جیسے
یا کوئی جھونکا جھلستے ہوئے بن میں جیسے

بہار میں کھیلتے رہے ہم بہار کی دلفریبیوں سے
خزاں جب آئے گی گلستاں میں خزاں سے دل شادماں کریں گے

جلوۂ گل نے، حسنِ گلشن نے
اک نہ اک دلکشی نے لوٹ لیا

نظم ''تم مگر نہیں آئے'' میں کہتے ہیں:

آدھ کھلے شگوفوں میں
مدھ بھرے پیالوں میں
چل رہی ہے پُروائی
جیسے تو خیالوں میں
میں تھا کتنا سودائی

تم مگر نہیں آئے

نظم "عظیم شفقت" میں کہتے ہیں:

عظیم فطرت کی شفقتوں میں
ہر اک کا حصہ مساویانہ

سلیم واحد سلیم انسانی عظمت کے قائل ہیں۔ وہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس کی وسعتوں کو بیان کرتے ہیں کہ انسان ہی فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے وہ ایک نظم میں کہتے ہیں:

وہ کون تھا؟
جس نے زہر کا پیالہ جام مے کی طرح پیا تھا
وہ کون تھا؟
جو صلیب پر آفتاب تاباں بنا ہوا تھا
جو بادلوں کے عمیق سایوں میں
باد و باراں میں
آسمانِ وفا پہ تابندہ تر ہوا تھا
وہ کون تھا؟
جس نے گھر لٹایا
تمام کنبے کی گردنیں دیں
اور اپنا سر دے کے جاودانی حیات کا راستہ دکھایا

سلیم واحد سلیم کے کلام کا ایک بڑا حصہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق ہے۔ شاعر نے وطن کی محبت میں اپنی تخلیقی قوتوں کو ایسی خوبصورتی سے صرف کیا کہ مردہ قومیں بھی زندہ جاوید ہو گئیں۔ ایک نظم "۶ ستمبر" میں کہتے ہیں:

پورے نو گھنٹے دشمن کو روکا گیا
جس کا آیا ہوا سخت جھونکا گیا
رائیگاں اس کا وار اور دھوکا گیا

اور یہ جنگ تاریخ بنوا گئی
اک بریگیڈ پر کمپنی چھا گئی

ایک نظم "سر عقیدت سے جھکنے پہ مجبور ہے" میں قوم کے فرزندوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ان کے ایثار سے آج ہم زندہ ہیں
اور قربانیوں سے وطن سرخرو
خون سے سینچ کر سرزمین وطن
ذرے ذرے کو بخشا ہے ذوق نمو

اگر ہم سلیم واحد سلیم کے کلام کا بغور جائزہ لیں تو سوز و گداز، تغزل، بے ثباتیٔ دنیا، اخلاقی مضامین، تصوف کی چاشنی، حقیقت کا اظہار، جذبات کی صداقت، سادگی، روانی، برجستگی و شگفتگی جیسی خصوصیات جا بجا بکھری ہوئی نظر آئیں گی۔

جس طرح سلیم واحد سلیم کے کلام کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے اسی طرح فنی لحاظ سے بھی ان کی شاعری بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ انہوں نے روایتی علامتوں اور استعاروں کو جو کثرت استعمال کے باعث اپنی ندرت کھو بیٹھتے تھے دوبارہ نئے معنوں میں استعمال کر کے حیات تازہ بخشی۔

ہر لمحہ عمر بھر کے لئے نقش بن گیا
اب دل گئے دنوں کی مزین کتاب ہے

ترے بغیر ترے قربِ جانفزا کے بغیر
کھلا بھی دل تو کھلا مثلِ لالۂ صحرا

جس طرح ہر بڑا شاعر اپنی شاعری میں نئی تراکیب اور نئی علامتوں سے اپنے اشعار کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے، بالکل اسی طرح سلیم واحد سلیم نے بھی اپنی شاعری کو نئی علامتوں اور نئی تراکیب سے مالا مال کیا۔ نئی تراکیب کے ساتھ ساتھ اگر فکری سطح بھی بلند ہو تو شاعر اپنے دور میں کامیاب اور آنے والے لوگوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔

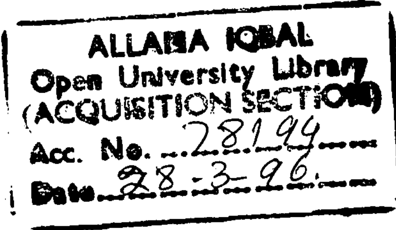
نرم پھولوں میں ابھر آیا ہے لاوے کا مزاج
برف بھی ہے زندگی کی برہمی کی سخت جھاگ

عجیب کرب و بلا ہے تمہارے ہجر کا دشت
کہ جس سے دور نہیں وصل جانفزا کا فرات

کچھ ایسی ظلمتیں بھی ہم نے دیکھی ہیں کہ سوچا ہے
ضیائے مہر شاید مبتلا ہے تنگ دستی میں

سلیم واحد سلیم کی شاعری میں تشبیہات کا نیا اور انوکھا پن انہیں دیگر شعراء میں انفرادیت عطا کرتا ہے۔

ترا خیال یا گونج اٹھی ہے تنہائی
صدائے جنبشِ لب ہے کہ پائلوں کی صدا



دل اس طرح غم دوری کو سہہ گیا جیسے
کسی عزیز کے مرنے پہ صبر آ جائے

تیری محفل میں ہوئی اپنی نظر یوں حیراں
جس طرح شہر میں آ جائے کوئی صحرائی

شاعری کے مطالعے میں تمثال کی اہمیت کو ہر زمانے میں تسلم کیا گیا ہے ایسی بصری و صوتی تمثالیں جو عام بول چال کی زبان کے استعمال کے باعث محض ابلاغِ معنی کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہیں، وہ بالعموم دھندلا جاتی ہیں۔ شاعر اپنے شاعرانہ استعمال سے ایسے الفاظ کی دھندلی تصاویر کو پھر سے زندہ کرتا ہے۔ لفظوں کو زندہ کرنے کے اس عمل میں استعارے کی تخلیق ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم سلیم واحد سلیم کی شاعری کو دیکھیں تو تشبیہات سے زیادہ استعارات نظر آتے ہیں۔

بڑھا ہے پھر دل امیدوار کا دامن
چلی ہے پھر سے تیری سمت آنسوؤں کی برات

چاند تاروں پہ نظر جا کے پلٹ آتی ہے
اپنے ہی دیدۂ بے خواب نظر آتے ہیں

مطلعٔ زیست ہے غبار آلود
دھندلی دھندلی سی بزم عالم ہے

سلیم واحد سلیم نے صنائع بدائع سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے کلام میں صنعتِ تضاد، مراۃ النظیر اور صنعتِ تلمیح کا استعمال زیادہ ملتا ہے جس سے کلام میں حسن اور جامعیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر صدمہٴ جاں گُسل سے الجھے
ہر غم میں خوشی سمو گئے ہم

فصل بہار آئی لیکن بہار کب تک
غنچوں کی مسکراہٹ گل کا نکھار کب تک

مجھے دے اذن کہ میں توڑ دوں طلسم خاموش
زمانہ یہ نہ کہے اب کہاں کوئی منصور

سلیم واحد سلیم ماں کی طرف سے ایرانی النسل تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی ایران میں پائی۔ لہذا فارسی سے محبت اور دوسرے غالب و اقبال کے اثر کے باعث ان کے کلام میں فارسیت کا گہرا رچاؤ نظر آتا ہے۔ مرزا غالب کی طرح سلیم واحد سلیم کو بھی اپنی فارسی دانی پر ناز تھا۔ انہوں نے فارسی تراکیب کو اس حسن اور خوبی سے استعمال کیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر بار نہیں ہوتیں۔

شکوہٴ جور بے کراں کر نہ کبھی یہاں وہاں
بن کے حریفِ آسماں سوزشِ غم نہ کر قبول

چشم تر سے سیلِ اشکِ غم رواں ہوتا رہا
ماجرائے دردِ بے پایاں بیاں ہوتا رہا

ہم تو شبنم کی خنک تابی سے بھی جلتے رہے
ہم سے کم ہوں گے سلیم آشفتہ سر آتش بجاں

پھر دیدہٴ پُرآب میں ہے رنگ سکوں کا
پھر اپنی ہی پلکوں میں جمالِ لبِ جو ہے

شاعر نے غنایت پیدا کرنے کے لئے طویل اور مترنم بحروں کا انتخاب کیا ہے۔ لفظوں کی تکرار، قافیوں کے التزام اور مصرعوں کو دہرا کر موصوف نے آہنگ اور ترنم پیدا کیا ہے۔ یوں ایک نغمہ ترتیب پاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہئیت کے نئے نئے تجربات بھی ملتے ہیں۔

موصوف کے کلام اور تراجم میں جہاں سادگی ہے وہاں نغمگی اور غنائیت بھی موجود ہے۔ جہاں سوز و گداز ہے وہاں فلسفیانہ نقطۂ نظر بھی نمایاں ہے۔ جہاں ہئیت کے تجربے اور زور بیان ہے وہاں بحروں کا استعمال بھی خوب ہے۔ وہ نہاہیت شائستہ زبان کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں شعور، جذبے اور ہیئت میں توازن پایا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر ان کا لہجہ تفکر آمیز ہے۔ وہ جذبے اور تفکر کو ملاتے ہیں۔ کائنات کے عناصر پر فلسفیانہ نظر ڈالتے ہیں۔ انہیں غموں سے نباہ کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ نہایت مہذب اور شائستہ ذہن کی تخلیق ہے۔

بحیثیت مجموعی سلیم واحد سلیم ایک مشکل پسند شاعر ہیں۔ یہ مشکل پسندی کئی سطحوں پر نمایاں ہے کہ وہ فلسفیانہ اور فکری مزاج کے شاعر ہیں لہذا ان کے اشعار میں فکری بالیدگی، فلسفیانہ عمق، غموں سے ٹکرانے کا انداز، ذات اور فطرت و کائنات کا تصادم اور مختلف تضادات کو ہم آہنگ کرنے کا انداز انہیں معاصرین میں منفرد کرتا ہے۔ مشکل پسندی کی دوسری سطح ان کے اسلوب میں اچھوتی تراکیب، مشکل الفاظ کی بندش، ادق قافیوں کا انتخاب اور فارسیت کے عمل دخل سے نمایاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود موصوف کا اسلوب نگارش ایسا ہے کہ ہر شعر پر دل کھنچا چلا جائے ہے اور طرز ادا ایسی کہ مرغان چمن انگشت بدنداں ہو جائیں۔ الفاظ پر قدرت ایسی کہ جب چاہیں، جس لفظ کو چاہیں، جس معنی میں چاہیں، اتنی روانی سے ادا کریں کہ قاری سر دھننے لگے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ موصوف سے زمانے نے وفا نہ کی۔ ورنہ علم وادب کا یہ خزانۂ بیش بہا تاجروں کی بند صندوقچی میں نہ پڑا رہتا۔ اگر زمانہ ساز گار ہوتا تو سلیم واحد سلیم بیسویں صدی کے قد آور اور منفرد اسلوب کے مالک فنکار سمجھے جاتے۔ واقعہ یہ ہے کہ جلال و جمال کا یہ شاعر لاہور کے باغوں اور سڑکوں پر اپنے تخلیق پاروں کو لئے سہما سہما پھرتا رہا اور آخر کار محرومیوں کو دامن میں سمیٹے اپنے تخلیقی مہ پاروں کو بے یارومددگار چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ ان کا نہ تو کوئی مجموعہ کلام چھپا اور نہ ان کی عظمت کا کسی کو احساس ہو سکا۔ ان کے کلام کو درخور اعتناء نہ سمجھ کر دور حاضر کے باشعور انسانوں سے ایسی غلطی سرزد ہوئی کہ جس کا کفارہ ادا کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔

وہ کہتے ہیں:

اجل پہ تُف ہے کہ ایسے گہر بھی ہوں تہہِ خاک
کہ جن سے زیست چمک مستعار لیتی ہے

غزلیں

ترتیب

۶۲- تجھے گلہ کہ محبت سے مجھ کو مس ہی نہیں
۶۳- حسن کا حربہ نگاہ دل نشیں تک ہی نہیں
۶۴- وہ نگاہ شوق سے کچھ دور ہو سکتے نہیں
۶۵- مری نظر سے نظر ملاؤ، کچھ اور میرے قریب آؤ
۶۶- زندگی تلخ ہے تو مت گھبراؤ
۶۷- آستینوں میں نہاں خنجر براں رکھو
۶۸- کہیں یہ بات بھی اے دوست ناگوار نہ ہو
۶۹- ہر خموشی تھی فغاں، ضبط فغاں کے ساتھ ساتھ
۷۰- جب بھی بکھرا گلوں کا شیرازہ
۷۱- دلفریب تھی کتنی دشمنوں کی عیّاری
۷۲- پلادے زہر نہیں جبکہ انگبیں ساقی
۷۳- ترے بغیر فضا سازگار ہو نہ سکی
۷۴- غزل ہے سینہ زنی میر کی نہ فانی کی
۷۵- عشرت زندگی کہاں نہ ملی
۷۶- منتشر ہیں میری آہوں کے شرارے اب بھی
۷۷- آشیانے کے مقابل، آشیاں سے دور بھی
۷۸- اے دل آزردہ ترک غم بھی ہو جائے کبھی
۷۹- کبھی ہیں گریاں، کبھی ہیں خنداں، کبھی ہے غم تو کبھی خوشی بھی
۸۰- میری نظروں میں مری منزل رہی
۸۱- باہر کی سمت جا کے نظر لوٹتی رہی
۸۲- ہر تمنا عذاب ہو کے رہی
۸۳- فقط نہ سعیٔ مسرت خراب ہو کے رہی
۸۴- ہر موج بحر غیرت گرداب ہو گئی
۸۵- ہر امید و خوف فردوس و جہنم چھوڑ دے
۸۶- جب کبھی پھیل گئے اندھیارے
۸۷- لطف کیا ملے گا اب حال دل سنانے سے
۸۸- سرشک غم کی زباں سے کب تک بیان درد نہاں کریں گے
۸۹- ہے زندگی تو پھر ترے کرم کا لطف اٹھائیں گے
۹۰- آہوئے دشت کی مانند رم آثار لگے
۹۱- دل نوازی کی ادا پھر بھی دل آزار لگے
۹۲- عجب کارنمایاں کرتے جاتے ہیں جہاں والے
۹۳- کسی ویرانے میں تسکین دل زار ملے

۹۴- تلخیٔ زندگی کا نام نہ لے
۹۵- نہ ہوشیار ہی سمجھے اسے نہ دیوانے
۹۶- کسی کو اپنے دل میں جلوہ آرا کر لیا ہم نے
۹۷- رکھا نہ کہیں کا ہمیں بے راہ روی نے
۹۸- جب تبسم ترے ہونٹوں پہ بکھر جاتا ہے
۹۹- یاس وہ دیو جو ہر گل کو مسل جاتا ہے
۱۰۰- وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے
۱۰۱- کہاں خلوص ہوس کے خزف میں رہتا ہے
۱۰۲- سیاہ خانہ غم میں یہ کون آیا ہے
۱۰۳- گو تلخ ہے شراب مگر پھر شراب ہے
۱۰۴- دیکھ سکتے ہم تو یہ رنگین منظر دیکھتے
۱۰۵- ہم ہی افسردہ فرط یاس سے تھے
۱۰۶- رونق صد بہار کھو بیٹھے
۱۰۷- تو ہی پابند نگاہ امتیاز آلود ہے
۱۰۸- جب بھی لمحات زر فشاں نہ رہے
۱۰۹- کبھی حیات کا غم ہے کبھی ترا غم ہے
۱۱۰- زندگی ربط عشرت و غم ہے
۱۱۱- یہ کیسے ہمصفیران چمن ہیں کیسا گلشن ہے
۱۱۲- قفس میں بادِ صبا گلستاں سے آتی ہے
۱۱۳- اب آ بھی جا کہ مری جاں نکلتی جاتی ہے
۱۱۴- کارواں باقی ہے آواز جرس باقی ہے
۱۱۵- جہاں میں تلخیٔ غم ہی نہیں قرار بھی ہے
۱۱۶- گو کہ اب حوصلہ غم نہ توانائی ہے
۱۱۷- جہاں جہاں غم دوراں نے لی ہے انگڑائی
۱۱۸- دشت غربت میں ساتھ ساتھ آئے
۱۱۹- پھر کہیں افشائے راز دل کا ساماں ہو نہ جائے
۱۲۰- ہزاروں تاریک راستوں میں قدم قدم پر دیئے جلائے
۱۲۱- عشق میں غم تمام بھول گئے
۱۲۲- رونق لالہ زار کیا کہیے

-------O-------

شکم سیری اور اس کے بعد تمباکو کا اک سوٹا
جو صحرا میں بھی حاصل ہو تو پھر ہر سو ہے گل بوٹا

ابھی نوخیز کلیوں کی طرف نظریں اٹھائی تھیں
اِدھر اک گل اُدھر کوئی شگوفہ شاخ سے ٹوٹا

سراپا جو لطافت تھی، جو رنگت تھی، جو نکہت تھی
مقدر اپنا کتنی نرم و نازک چیز سے پھوٹا

چلو یہ تجربہ مہنگا نہیں، اک صدق پرور کو
جو دیکھا جانب مقتل تو پایا سر بسر جھوٹا

شب تاریک کا سینہ ستارے چھید سکتے تھے
زمیں کی سمت سے بھی پھلجڑی کا سلسلہ چھوٹا

سلیم اب شہر کے رکھوالے جتنے ہیں نرالے ہیں
کہ جتنی بار بھی لُوٹا غریبوں کا نگر لُوٹا

-------O-------

جانے کس کے اشک غم ہیں ان ستاروں پر نہ جا
جانے کس کے داغ دل ہیں لالہ زاروں پر نہ جا

دو گھڑی کی تازگی پھر دائمی افسردگی
غنچہ و گل کے تبسم کے نکھاروں پر نہ جا

چہرۂ گل پر ہجوم اشک شبنم بھی تو دیکھ
اہلِ غم پر نظر کر عشرت کے ماروں پر نہ جا

حاصلِ فصلِ بہاراں جز خزاں کچھ بھی نہیں
اس دو روزہ زندگانی کی بہاروں پر نہ جا

امتزاجِ رنگ و بو وہ بھی سراب اندر سراب
فطرتِ رنگیں کے رنگیں شاہکاروں پر نہ جا

دہر کیا ہے لغزشِ چشمِ بصیرت کے سوا
حسن بھی اک واہمہ ہے گل عذاروں پر نہ جا

-------O-------

تیری محبت میں ہم نے اکثر کچھ اس طرح وقت بھی گزارا
کہ تابِ غم تک نہ تھی میسر مگر سکوں بھی نہ تھا گوارا

تجھے مبارک ہو امنِ ساحل تجھے مبارک رہے کنارا
میں ڈوبتا ہوں تو ڈوبنے دے نہ دے سہارا نہ دے سہارا

نظر نظر بے قرار جلوہ مگر کہاں طاقتِ نظارا
جو ہو سکے تو مری نگاہوں کو اپنی نظروں سے دے سہارا

مجھے جنونِ طلب نے لوٹا مجھے مری گمرہی نے مارا
وگرنہ دل سے کسی نے پیہم کبھی صدا دی کبھی پکارا

پلا بھی ساقی کہ غم کے ہاتھوں جگر ہے خوں دل ہے پارا پارا
سکوں کے لمحے تو ہوں میسر عذابِ دوزخ ہمیں گوارا

یہ کس کی محفل کی سمت جاتی ہے کہکشاں کی رہِ منور
یہ کون چھپ چھپ کے ماہِ انجم سے کر رہا ہے مجھے اشارا

ابھی تو وہ مہربان سے ہیں ابھی تو جی بھر کے پیار کر لیں
نہ جانے پھر اوج پر کب آئے ہماری تقدیر کا ستارا

سلیم دریائے زندگی میں بہت سی طغیانیاں بھی آئیں

بہت سے میں نے تھپیڑے کھائے مگر کبھی حوصلہ نہ ہارا

-------O-------

فشارِ فکر سے پھٹتا ہوا دماغ مرا
بجائے بادہ دھواں سے ہے پُر ایاغ مرا

نظر فضا میں ہے آنکھوں میں رنگ مستقبل
خلا نوردیٔ پیہم ہے سیر باغ مرا

مرا کلام ہی آئینہ میری ذات کا ہے
لگا سکو گے مرے شعر سے سراغ مرا

ہنسی میں جیسے چمکتے ہوئے شرارے ہوں
ہر ایک رنگ میں جلتا ہے دل کا داغ مرا

وہی خیال جو راتوں کی نیند اڑا جائے
وہی خیال ہے سامانِ صد فراغ مرا

سلیم جس کے تلوّن میں ہے بہار و خزاں
اسی سے عہد جوانی کا باغ و راغ مرا

-------O-------

میں تیرے عیش و طرب کی محفل کا لطف کیسے اٹھا سکوں گا
کچھ اس طرح غم میں کھو گیا ہوں کہ فرصتِ یک نظر نہیں ہے

ہر ایک کے دل سے وہ باخبر ہیں ہر اک کی حالت نگاہ میں ہے
یہ کون مانے کہ میری حالت کی ان کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

سلیم گو شب کی ظلمتوں کا طلسم ٹوٹا ہوا ہے لیکن
سحر جسے ہم سمجھ رہے ہیں بجز فریبِ نظر نہیں ہے

-------O-------

خدا ہی جانے کہ آخر مآل کیا ہو گا
خراب درد محبت کا حال کیا ہو گا

تری بلا سے اگر مٹتے جا رہے ہیں ہم
ہمارے مٹنے سے تجھ کو ملال کیا ہو گا

ہر ایک یاس ہے پیغام صد ہزار امید
ہجوم یاس سے دل پائمال کیا ہو گا

جہاں ہے جلوۂ زیرِ نقاب ہی سے خراب
نقاب اٹھی تو زمانے کا حال کیا ہو گا

نظر سے ہو نہ اگر کارِ ترجمانیٔ شوق
تو پھر زباں سے بیاں دل کا حال کیا ہو گا

کسی سے کر نہ سکے ہم کبھی سوالِ کرم
سلیم حشر میں ہم سے سوال کیا ہو گا

-------O-------

سکوت کا یہی عالم رہا تو کیا ہو گا
کچھ عرضِ حال نہ اظہار مدعّا ہو گا

کمالِ تلخیِ غم کم تو کیا سوا ہو گا
اگر جنونِ محبت سے دل رہا ہو گا

نظر سے دور سہی دل سے دور کیا ہو گا
نفس نفس میں تو ہی تو چھپا ہوا ہو گا

ہمیں تو سوزِ محبّت سے کام ہے اے دوست
وہ اور ہونگے جنہیں ذوقِ ماسوا ہو گا

نہ جانے کیوں یہ جہاں مجھ سے ہو گیا برہم
جنوں میں لب پہ ترا نام آ گیا ہو گا

ہزار راہ الجھتی ہوئی سی ہو لیکن
نشانِ راہ مگر تیرا نقشِ پا ہو گا

تجھے تلاشِ سلیم شکستہ دل ہے مگر
وہ بدنصیب ترے غم میں مٹ گیا ہو گا

-------O-------

محبت میں، وفا میں، خوب ہے جی سے گزر جانا
یہاں ہستی مٹا دینا ہے ہستی کا سنور جانا

جنوں کی دھن میں ہر پتھر کو ہم نے سنگ در جانا
کوئی بھی رہگزر ہو ہم نے تیری رہگزر جانا

بہت ڈھونڈا خلوص دوستی اے وائے ناکامی
جسے بھی دوست سمجھا آخرش بیداد گر جانا

وہی سب سے زیادہ حالِ دل سے بے خبر نکلے
جنھیں سب سے زیادہ حالِ دل سے باخبر جانا

مری مجبوریاں لاچاریاں کچھ بھی سہی لیکن
قیامت ہے ترے دامن پہ اشکوں کا بکھر جانا

یہاں میں نے محبت کے، وفا کے، گیت گائے ہیں
ذرا سا ہو سکے تو قافلے والو ٹھہر جانا

ترے آنے سے کیا کیا گلستاں پر رونقیں برسیں

تماشا کردنی تھا ذرّے ذرّے کا نکھر جانا

سلیم اک عمر گزری ہے بیان آرزو کرتے
یہ قصہ کتنا طولانی تھا، کتنا مختصر جانا

-------O-------

بھولتے ہیں جو مجھ کو کیا ضرور بتلاتا
میں سلیم ہوں مجھ کو آپ نے نہ پہچانا؟

قتل عاشقوں کا ہے، جشن ظالموں کا ہے
تم بھی دیکھنا چاہو تو ضرور آ جانا

ہم نے پیار کا دھوکا جان بوجھ کر کھایا
زندگی کو لازم تھا رنگ روپ پر آنا

لوٹ پھیر کر ہم پر ظالموں کی تہمت ہے
جن کا کام رہتا ہے بس قیاس دوڑانا

بے خودی میں پنہاں تھی آگہی کی اک دنیا
ایک ایک رستے سے اتنا بے خبر جانا

آج کا ہے غم آساں کل کے خواب رنگیں سے
اک نہ اک تصور سے اپنے جی کو بہلانا

-------O-------

ہمارا کام جی کو بزم تنہائی سے بہلانا
مگر تم غیر کی افسانہ سازی میں نہ آ جانا

کسی کی مصلحت کوشی، کسی کی خود فراموشی
نہ تم نے ہم کو پہچانا نہ ہم نے تم کو پہچانا

ہمارے درد کے لاکھوں ہی افسانے بنے، لیکن
وقارِ عشق کو لازم نہ آیا جی کا بھر آنا

سوا نیزے کے سورج سے زیادہ جان لیوا ہے
قیامت سے سوا ہے تیرے جلووں کا سمٹ جانا

بہت ہی سرد مہری سے ہمارا نام لیتے ہیں
وہ جن کا شغل ہے دل میں ہمارا نام دھرانا

کدورت کُہر بن کر چھا گئی تھی دل کے گلشن پر
ترا آنا ہے جیسے آفتاب صبح کا آنا

ہر اک گلبن سے ہم نے کسب راحت کی تمنا کی
جلی شاخِ نشیمن تو چمن کو اپنا گھر جانا

کبھی یوں بھی ہوا ہم نے متاعِ ہر دو عالم کو
نظر بھر کر جو دیکھا تو سراسر بے اثر جانا

سلیم اس سادگی کا اصطلاحاً نام کیا رکھیں
کسی کی مست نظروں کا نگاہِ غیر تک جانا

-------O-------

درد کم ہے یاد جاناں کو نہ جانے کیا ہوا
لذت رنج فراواں کو نہ جانے کیا ہوا

پھیکی پھیکی چاندنی، افسردہ افسردہ چمن
گلستاں کو، ماہِ تاباں کو، نہ جانے کیا ہوا

اب وہ آئے ہیں تو آنکھوں میں اک آنسو بھی نہیں
آج اشکِ غم کے طوفاں کو نہ جانے کیا ہوا

وہ تغافل کوش اور آمادۂ لطف و کرم
بیٹھے بیٹھے دشمن جاں کو نہ جانے کیا ہوا

وہ در و دیوار زنداں کو گرانے کا جنوں
اُف جنون اہلِ زنداں کو نہ جانے کیا ہوا

دست انسانی حنائی خونِ انسانی سے ہے
بدتراز حیواں ہے، انساں کو نہ جانے کیا ہوا

توڑ ڈالا ضبط کا ہر سلسلہ دل نے سلیم
فرطِ غم سے آہ ناداں کو نہ جانے کیا ہوا

-------O-------

جب کبھی تو نظر سے دور ہوا
دل سے نزدیک تر ضرور ہوا

اوج پر ہے کمالِ رسوائی
شہرۂ عشق دور دور ہوا

با رہا بے وجہ اداس ہوئے
با رہا بے سبب سرور ہوا

جس کسی پر تری نظر اٹھی
فرطِ نشّہ سے چور چور ہوا

حالِ دل رنگِ رخ سے فاش ہو کیوں
دردمندوں سے ہاں قصور ہوا

اب مسرت بھی خوش نہیں آتی

دل پہ کیا حال ناصبور ہوا

ان کے جلووں کی زد میں آ کے سلیم
دل کا ہر ذرّہ رشکِ طور ہوا

-------O-------

ہر ایک مرحلۂ غم ہمیں گوارا تھا
کہ دل میں تُو تھا نظر میں ترا نظارا تھا

وفائے حسن گریزاں پہ تکیہ کیا کرتے
کہ یہ بھروسا تو اڑتا ہوا سہارا تھا

چلے تھے میکدۂ عاشقی سے ہم جس دم
کسی نے درد سے شاید بہت پکارا تھا

رہا جراحت دل کا بہت دنوں یہ سماں
کہ برگِ گل ہی ہمیں مثل سنگ خارا تھا

چمن میں ہم رہے آوارۂ جنوں لیکن
صبا کی طرح تری زلف کو سنوارا تھا

جنوں میں دست و گریباں ہوا کئے باہم
وگرنہ حسن ہر اک اہل دل کو پیارا تھا

شبِ فراق تو موج ہوا میں بھی تھی جلن
کوئی ستارہ بھی چمکا تو اک شرارا تھا

چھڑا رہا ہے غم عاشقی سے اب دامن
سلیم دل تو کبھی اس طرح نہ ہارا تھا

-------O-------

مانا کمالِ حسن کا ان کو غرور تھا
میں بھی نہ جھک سکا کہ مرا دل غیور تھا

شہہ رگ سے بھی قریب وہ جانِ سرور تھا
لیکن مری نظر سے بہت دور دور تھا

کیا دل میں تم تھے یا کوئی نشتر تھا کیا تھا دوست
کیوں اتنا بے قرار دل ناصبور تھا

یہ اور بات ہے کہ کسی نے جفا بھی کی
ورنہ خیالِ اہلِ محبت ضرور تھا

میں نے ہی تجھ سے بڑھ کے لگائیں توقعات
تو کس لئے خجل ہے مرا ہی قصور تھا

تیرہ شئے غم کدۂ زیست سب درست
لیکن ہمارے ساتھ محبت کا نور تھا

کس نے مری نظر کو دکھائے ہزار رنگ
کس کے جمالِ شعبدہ گر کا ظہور تھا

دنیا سلیم ایک جہنم سے کم نہ تھی
دیکھا جسے بھی درد و مصیبت سے چور تھا

-------O------

قدم قدم پہ ترا غم فریب ساماں تھا
غمِ حیات بھی تیرے ہی غم میں پنہاں تھا

تمہیں کچھ اہلِ وفا سے کشیدہ خاطر تھے
وگرنہ عذرِ تغافل بہت ہی آساں تھا

حیات و مرگ کا ہر راز دل پہ فاش ہوا
تری نظر کے تغیر کا یہ بھی احساں تھا

جنونِ غم میں ہوا بارہا یہی محسوس
گلوں کا دامنِ صد چاک اپنا داماں تھا

ترے خیال سے بھی آجکل گریزاں ہے
یہ دل کہ تیری محبت میں مخشر ستاں تھا

ستم زدہ تو بہرحال شاداں تھے سلیم
یہ اور بات ہے خود حسن ہی پشیماں تھا

-------O-------

پھر وہی بانیِٔ بیداد و جفا یاد آیا
دل میں وہ درد سا اٹھا کہ خدا یاد آیا

دل نے پھر چھیڑ دیئے عشق و وفا کے قصے
پھر وہی دشمنِ ارباب وفا یاد آیا

ہم نے چاہا نہ چلیں تیرے اشاروں پہ مگر
دفعتاً شیوۂ تسلیم و رضا یاد آیا

میں بھی پیمانِ وفا توڑ ہی دیتا تجھ سے
لیکن اے دوست ترا عہدِ وفا یاد آیا

اب کہاں ضبط کہ ہے وقتِ وداعِ تسکیں
اب کہاں ہوش کہ پھر ہوش ربا یاد آیا

پھر جبیں میں خلش سجدۂ بے لوث ہوئی

پھر سلیم آج وہ نقشِ کفِ پا یاد آیا

-------O-------

بہت لطف ہمیں شام انتظار آیا
نہ تم ہی آئے نہ دل کو کوئی قرار آیا

خزاں نصیب تھے جب وقت سازگار آیا
اِدھر وہ آئے اُدھر موسم بہار آیا

کمال جذب محبت بروئے کار آیا
مرے سکوں کے لئے کوئی بے قرار آیا

تری تلاش کی دھن اور جنون کا عالم
خدا ہی جانے کہاں تک تجھے پکار آیا

پئے سکونِ غمِ دل کسی کی محفل میں
بحالِ زار گیا اور بحالِ زار آیا

سمجھ رہا تھا اسے بھول ہی گیا ہو گا
کہ دفعتاً مرے دل کو خیال یار آیا

اُف اضطراب کا عالم کہ تیرے کوچے میں
ہزار بار گیا اور ہزار بار آیا

ہزار ادائیں ہر اک دلنشیں و مہر آگیں
بتائیں کیا ہمیں کس کس ادا پہ پیار آیا

یہ کس کا پاسِ ادب تھا کہ مجھ سا رندِ خراب
پئے ہوئے بھی سرِ بزم ہوشیار آیا

اٹھ اور جام پلا، ساز اٹھا، ترانہ گا
ترا سلیم، ترا رندِ جاں نثار آیا

-------O-------

اے جذبۂ دل تو بھی کچھ کام نہ آیا
تڑپے تو بہت ہم مگر آرام نہ آیا

سو طرح سے کی غم کی شکایت مگر اے دوست
تیرا ہی ادب تھا کہ ترا نام نہ آیا

دل ہو نہ سکا مائلِ رنگینیٔ دنیا
یہ طائر ہوشیار تہِ دام نہ آیا

جب بزم میں گردش میں ہوئے جام و صراحی
پھر تذکرۂ گردشِ ایام نہ آیا

کتنے ہنستے لوگوں کو دل دکھا ہوا پایا
بے نیازِ غم کو بھی غم سے آشنا پایا

برق پا جوانی تھی زندگی بھی فانی تھی
پھر بھی تیری چاہت میں لطف بے بہا پایا

ہر خوشی تھی رنج آمیز عشرتیں تھیں غم انگیز
ہم نے ہر مسرت کو سایۂ ہما پایا

رنگ رنگ کے جلوے اور اپنی محرومی
اے خدائے محبوبی ہم نے تجھ سے کیا پایا

بارہا خموشی میں ڈھل گئی فغاں اپنی
دل کی دھڑکنوں کو بھی سازِ بے صدا پایا

بے بسی سلیم اپنی اور بھی ابھر آئی
ہم نے جور خوباں کو جب وفا نما پایا

-------O-------

جلوہ گل، نے حسنِ گلشن نے
اک نہ اک دل کشی نے لوٹ لیا

خامشی کے مہیب صحرا میں
لذتِ خستگی نے لوٹ لیا

چاندنی ایک نغمۂ خاموش
دل کو اس نغمگی نے لوٹ لیا

راہبر راہزن سہی لیکن
ہم کو درماندگی نے لوٹ لیا

فرصتِ عیش جب سلیم ملی
ذوقِ آوارگی نے لوٹ لیا

-------O-------

بات پھر اس ستم شعار کی بات
کب رہی اپنے اختیار کی بات

جاگ اٹھے کتنے خواب آنکھوں میں
جب چھڑی حسن کے دیار کی بات

جگمگا اٹھیں شبنمیں راتیں
چل پڑی حسن کے دیار کی بات

کھلتے پھولوں کا تذکرہ ہی سہی

نہ سہی جانِ بے قرار کی بات

موسمِ گل میں تجھ کو بار نہ ہو
ایک بیگانۂ بہار کی بات

ہم تباہ حال ہی سہی لیکن
کیوں کریں جانِ سوگوار کی بات

-------O-------

وہی ہیں حاصل، ہستی وہی ہیں جانِ حیات
جو تیرے ساتھ گزارے ہیں کچھ حسیں لمحات

خوشا وہ دورِ محبت، خوشا وہ دورِ حیات
وہ قہقہے، وہ تبسم، وہ کیف، وہ جذبات

جو تم گئے تو وہی رنج و غم پلٹ آئے
وہی ہیں ہم، وہی دنیا، وہی غم و آفات

یہ کس مقام پہ لائی ہے بے خودی مجھ کو
یہاں نہ دن ہے نگاہوں میں دن نہ رات ہے رات

ہزار اشارے تھے پنہاں ہماری باتوں میں
یہ اور بات ہے تو نے سنی نہ کوئی بات

دل آج پھر سوئے میخانہ لے چلا مجھ کو
کہ راہ میکدہ میرے لئے ہے راہ نجات

غمِ زمانہ سے فرصت نہ مل سکی ورنہ
دبے ہوئے ہیں مرے دل میں آتشیں نغمات

سلیم غم کدۂ زندگی میں عیش کہاں
یہی بہت ہے کہ مل جائے درد و غم سے نجات

-------O-------

حرف تقدیر کبھی یوں بھی مٹا ہے اے دوست
آہ بھرتے ہوئے کیوں محوِ دعا ہے اے دوست

میں بھی کہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی غم نہ رہے
کوئی دنیا میں مگر غم سے بچا ہے اے دوست

ہر طرف مائل صد مکر و ریا ہے انساں
ہر قدم سلسلۂ مکر و ریا ہے اے دوست

سخت دشوار ہے جینا یہ تو مانا لیکن
موت سے پہلے ہی مرنا بھی بُرا ہے اے دوست

کیا بجز مرگ کوئی چین نہیں مل سکتا
کیا فقط موت ہی ہر غم کی دوا ہے اے دوست

آج تک بے کس و مجبور ہی پایا لیکن
سنتا رہتا ہوں غریبوں کا خدا ہے اے دوست

وہی اربابِ ستم اور وہی جور و وفا
وہی ہر سمت بپا کرب و بلا ہے اے دوست

وہی دکھ درد، وہی غم، وہی صدمے، وہی کرب
جاں کنی میں وہی مخلوق خدا ہے اے دوست

پابجولاں ہے اب تک یہ ستم کش مزدور
آج بھی کشتۂ صد جور و وفا ہے اے دوست

غم نہ کر مٹ کے رہیں گے یہ فلک بوس محل
رنگ لانے کو ہی خون غربا ہے اے دوست

آج سرمایہ و غربت میں وہ آویزش ہے
جس سے گیتی میں قیامت سی بپا ہے اے دوست

کس قدر سوز سے معمور ہے ہر شعر سلیم
کیوں نہ ہو درد بھرے دل کی صدا ہے اے دوست

-------O-------

ہمارے دم سے ہے تزئینِ عالم ایجاد
ہمیں نے کی ہیں محبت کی بستیاں آباد

چمن چمن ہے ہمارے لہو کی شادابی
کلی کلی ہے ہماری وفاؤں کی روداد

جنہیں حیات کی زنجیر بھی نہ روک سکی
رکیں گے موت سے کیسے وہ بندہ آزاد

ڈرا سکی نہ ہمیں زندگی کی طغیانی
بھنور میں ڈال دی کشتی کہ ہرچہ بادا باد

کچھ ایسے دن بھی گزارے تری محبت میں
لبوں پہ مہر خموشی نگاہ میں فریاد

ہوئی ہے یورشِ غم بھی کبھی کبھی لیکن
چمن میں لالہ و گل کی طرح رہے ہیں شاد

تری نظر کا سہارا لئے ہوئے ہم نے

قدم قدم پہ کئے کتنے میکدے آباد

سلیم حسن کی کیا مہربانیاں کہیئے
ہوئے ہیں اہل محبت بھی داد پر بیداد

-------O-------

پیام لطف و کرم ہے کسی کی ہر بیداد
ستم ہے شاد اگر ہو نہ خاطرِ ناشاد

چمن میں سایۂ ابر بہار ہوتے ہی
ہزار حشر بپا کر گئی کسی کی یاد

دلِ شکستہ پہ ان کو بہت ہی پیار آیا
بنائے لطف ہوا میرا قصۂ برباد

بیاں ہو تابکجا داستانِ جور و جفا
غرض کہ تیرا کرم بھی ہے ہم پہ اک بیداد

حوادثاتِ زمانہ سے ہم کبھی نہ ڈرے
بھنور میں ڈال دی کشتی کہ ہرچہ بادا باد

نگاہ ماہ حسینوں کے رخ پہ پڑتے ہی
تڑپ تڑپ کے کیا میرے دل نے ان کو یاد

تھی ایک جنبش برق بلا کی دیر سلیم
چمن رہا نہ رہا آشیانۂ برباد

-------O-------

ٹوٹتے ہیں لعل و گوہر چشم تر سے بار بار
یوں گذرتے ہیں کسی کی رہگزر سے بار بار

مٹنے والے ہی نہیں اپنے مقدر کے حروف
ورنہ اشکِ غم بہائے چشمِ تر سے بار بار

بار بار ہوتی رہی دنیائے دل زیر و زبر
اس کو دیکھا ہے نگاہ فتنہ گر سے بار بار

ہوش کی حالت میں پہنچے ہیں تیرے در تک
بے خبر ہو کر اٹھے ہیں تیرے در سے بار بار

خود بخود جب دل سے مٹ جاتا ہے ناکامی کا رنج
ایسے عالم بھی گذرتے ہیں نظر سے بار بار

ذرے ذرے میں کسی کے جلوے پنہاں ہیں سلیم
دیکھتا ہوں دل کی چشم معتبر سے بار بار

-------O-------

جھوٹی جھوٹی غم گساری، جھوٹے جھوٹے غم گسار
اپنا غم رکھ اپنے دل تک غم گساروں پر نہ جا

ہو رہے گا اور بھی رسوائیوں کا سامنا
رازداں، کا کیا بھروسا راز داروں پر نہ جا

کس لئے یوں محو رنگ و بوئے گلشن ہے سلیم
ایسے رخصت گشتنی رنگین نظاروں پر نہ جا

-------O-------

سب سے غافل ہے اور سب کی خبر
حسن سے کم نہیں ہے حسنِ نظر

اک زمانہ تھا درمیاں ورنہ
دو قدم پر تھی تیری راہ گزر

کیا زمانہ بدل گیا اے دوست
یا بدل ہی گئی تمہاری نظر

ایسے لمحاتِ غم بھی گزرے ہیں
جن کی دل کو بھی ہو سکی نہ خبر

جلوۂ حسنِ بے پناہ کی خیر
آج ہے امتحانِ قلب و نظر

-------O-------

ہنسی آئی ہمیں اہل عداوت پر، زمانے پر
انہیں دھوکا خوشی کا ہے ہمارے مسکرانے پر

دلِ مضطر پہ کیا گزری نقاب رُخ اٹھانے پر
اگر کچھ بن پڑی تو کہہ سکیں گے ہوش آنے پر

حوادث کے سمندر میں اِدھر ڈوبے اُدھر اُبھرے
اُبھرتا ہے محبت کا سفینہ ڈوب جانے پر

غم دنیا، زمانے کے حوادث، رنج رسوائی
میں ہر غم بھول کر آیا ہوں تیرے آستانے پر

نہ لطف مے کشی ساقی نہ وہ جوش جنوں باقی
خفا ہے زندگی ہم سے کسی کے روٹھ جانے پر

کچھ اس صورت سے بڑھتا جا رہا ہے ذوقِ بربادی
کہ خود ہی برق بن کر گر پڑیں گے آشیانے پر

-------O-------

دل پر بس اک کرم کی نظر کر سکے تو کر

میری شبِ الم کی سحر کر سکے تو کر

اپنی فغاں رہینِ اثر کر سکے تو کر
اس بے وفا کے دل میں جو گھر کر سکے تو کر

دنیا میں رنج و غم سے کسے مل سکی نجات
لیکن خوشی خوشی سے بسر کر سکے تو کر

وابستہ دردِ عشق سے لطفِ حیات ہے
یعنی جہانِ غم میں گزر کر سکے تو کر

جو حاصلِ عبادت و مقبولِ حسن ہو
ایسا بھی ایک سجدہ اگر کر سکے تو کر

بہتر ہر اک سکوں سے غمِ اضطراب ہے
دنیائے دل کو زیر و زبر کر سکے تو کر

جو ہو سکے تو اشکِ محبت بہا سلیم
ان پر نثار لعل و گہر کر سکے تو کر

-------O-------

نہ پوچھ ہم سے کہ کس طرح سے گزاری عمر
غموں کی آگ میں جلتے رہے ہیں ساری عمر

مری دعا کہ مجھے ہو سکون مرگ نصیب
تری دعا ہے کہ مل جائے مجھ کو بھاری عمر

مجھے قبول ہے بے لطفیٔ حیات مگر
کٹے گی کیسے مسرت سے جب ہے عاری عمر

تری ہی یاد میں کاٹے ہیں دن جوانی کے
تری ہی یاد میں کٹ جائے گی ہماری عمر

تو ہی ہو جانِ محبت، تو ہی ہو جانِ حیات
ترے نثار، ترے حسن پر ہے واری عمر

انہیں وفا سے غرض ہو نہ ہو مگر ہم نے
گزار دی ہے بقیدِ وفا شعاری عمر

ہر ایک زخم محبت میں بن گیا ناسور
مگر کٹی نہ بفریاد و آہ و زاری عمر

جھلک دکھا کے جوانی تو ہو گئی روپوش
اب ایک یادِ جوانی ہے اور ساری عمر

سلیم ان پہ تصدق ہو زندگی کی بہار
وہ جانِ زیست ہیں پھر ان سے کیوں ہو پیاری عمر

-------O-------

جہانِ دل ترے جلووں سے ہو گیا معمور
کہاں کا شعلۂ سینا، کہاں کا جلوۂ طور

وجودِ عشق سے قائم ہے حسن کی شہرت
اسی نے کی ہیں تری بے نیازیاں مشہور

ہمیں بھی تھامے ہوئے تھا خیالِ خودداری
وہ ہم سے دور رہے جب باقتضائے غرور

نظر کے سامنے جلوہ نمائیاں کی ہیں
اگر رہا ہے کوئی دل کی وسعتوں سے دور

یہ کس کی مست نگاہوں کا فیض ہے ساقی
کہ ذرّہ ذرّہ ہے سرشار و بے خود و مسرور

مجھے دے اذن کہ میں توڑ دوں طلسمِ خموش
زمانہ یہ نہ کہے اب کہاں کوئی منصور

تجھے سمجھ نہ سکے ہم تو کچھ بعید نہ تھا
ہمیں خود اپنی حقیقت کا ہو سکا نہ شعور

مری نگاہ میں رقصاں ہے کائنات سلیم
عطا کیا ہے مجھے عشق نے کچھ ایسا سرور

-------O-------

ایک ایسی ہی جنبشِ تدبیر
ٹوٹ جائے یہ حلقۂ تقدیر

ماہ و انجم پہ بڑھ کے ڈالیں کمند
نہ رہیں پست ہمتی کے اسیر

میری باتوں میں شانِ خاموشی
اور خموشی میں لذتِ تقریر

تیرے جلووں کی زد میں ایک جہاں
تیری زلفوں کا ایک زمانہ اسیر

غمِ دوراں پہ ہنسنے والوں نے
تیرے غم کو بھی کر لیا ہے اسیر

ہم نے اس زندگی سے کیا پایا

اک زمانہ خفا ہے، تُو دل گیر

کچھ غلط فہمیاں ہوئیں ورنہ
تم بھی معصوم ہم بھی بے تقصیر

دل نے ایسے بھی غم اٹھائے سلیم
جن کی کوئی نہ ہو سکی تفسیر

-------O-------

تُو ہی اپنا نہیں ہے جب دمساز
شدتِ غم میں دیں کسے آواز

آج دُھرا رہی ہے تنہائی
چپکے چپکے سے داستانِ نیاز

دکھ بھرا راگ کس نے چھیڑ دیا
میرے ہاتھوں میں تھا خوشی کا ساز

کن خلاؤں میں جانے ڈوب گئی
دل نے دی جب کبھی تجھے آواز

میری رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں
وہ کسی کی نگاہ کا انداز

آ ہی جائیں گے وہ نہ ہو مایوس
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

آگ ہے بنسری کی دھن میں سلیم
پھونک ہی دے نہ شعلۂ آواز

پھر آ گئی بہار مہک اٹھے باغ و راغ
پھر ہے شمیم گل سے معطر دل و دماغ

کر زندگی خرابِ تجسس نہ ہمنشیں
جب رازِ ہست و بود کا ملتا نہیں سراغ

کیوں دیکھتے ہی دل میں مسرت ہے موجزن
گل ہیں چمن میں یا کہ چھلکتے ہوئے ایاغ

مجبوریاں ہیں ساتھ وگرنہ مرے حبیب
دل کی خوشی کہاں کہ خوشی سے اٹھائے داغ

ہم ہیں سلیم اور کسی کا خیال ہے
کچھ اور سوچنے کے لئے ہے کہاں فراغ

-------O-------

فصلِ بہار آئی لیکن بہار کب تک
غنچوں کی مسکراہٹ، گل کا نکھار کب تک

یہ درد و غم، یہ صدمے، یہ سوگوار لمحے
باقی رہیں گے یونہی پروردگار کب تک

اشکوں پہ کوئی قابو، نہ دل ہی اپنے بس میں
دیکھا کروں یہ سب کچھ، بے اختیار کب تک

ملتے رہے ہو مجھ سے بیگانہ وار لیکن
ملتے رہو گے مجھ سے بیگانہ وار کب تک

کچھ تلخ ہیں حقائق جن سے مفر ہے مشکل
ان تلخیوں سے لیکن سعیٔ فرار کب تک

یہ دوستی کی باتیں، یہ دشمنی کی گھاتیں
اور دوستی کے دشمن پوشیدہ وار کب تک

کب تک سلیم غم کے نشتر چبھا کریں گے
لٹتا رہے گا دل کا صبر و قرار کب تک

-------O-------

صبح کے وقت یہ مٹتی ہوئی اُمیدِ وصال
اب کوئی دم میں ہی بجھنے کو ہے فانوسِ خیال

ایک سے ایک حسیں پھول ہے گلشن میں مگر
اپنا دامن ہے تہی اے گُلِ خُوبی و جمال

آ کہ جی بھر کے سنیں روحِ جوانی کی پکار
اس سے پہلے کہ محبت ہو شناسائے زوال

اپنی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں دم لینے دے
لطفِ امروز کو یوں وعدۂ فردا پہ نہ ٹال

وقت اک موج کہ جس کا نہ ازل ہے نہ ابد
چند پیمانے ہیں یہ ماضی و مستقبل و حال

پھر وہی جذبۂ موہوم ابھر آیا ہے
وہی مبہم سی نگاہیں، وہی بے کار سوال

حسن کی ایک نگاہِ غلط انداز سہی
اک بہانہ ہی سہی جس سے طبیعت ہو بحال

آج اگر وقت، مسرت سے ہے محروم سلیم

یادِ ماضی سے مٹائیں غم مستقبل و حال

-------O-------

خود فراموشی کی لے میں جب بھی ڈھل جاتا ہے دل
جانے کس جادو سے عکسِ یار بن جاتا ہے دل

کون بتلائے کہاں ہے اب حدِ وصل و فراق
دھڑکنوں میں تیری ہی آواز بن جاتا ہے دل

جب سکوت شام کے پردے اٹھاتا ہے کوئی
نغمۂ وارفتگی کی تان بن جاتا ہے دل

حرفِ مطلب لب تک آ کر بھی ادا ہوتا نہیں
کانپتے جاتے ہیں لب اور ڈوبتا جاتا ہے دل

ہو اگر برہم دو عالم کی حقیقت ہیچ ہے
ورنہ حسن رہگزر سے بھی بہل جاتا ہے دل

یوں ہی مل جل کر گزرتی جا رہی ہے زندگی
دل کو بہلاتا ہوں میں اور مجھ کو بہلاتا ہے دل

ذرّہ ذرّہ جزوِ موجِ جاوداں بنتا ہے جب
موت کا عقدہ اسی لمحے میں سلجھاتا ہے دل

سہہ رہا ہے کیسا کیسا حملۂ بادِ سموم
یہ چمن رنگیں امیدوں کا جو کہلاتا ہے دل

-------O-------

ہر سکونِ زندگی سے اب تو گھبراتا ہے دل
اللہ اللہ غم نہ ہونے کا بھی غم کھاتا ہے دل

وسعتِ دل میں جب ان کو جلوہ گر پاتا ہے دل
عالمِ امکاں کی ہر شے بھول سا جاتا ہے دل

نغمۂ کیف و مسرت جب کبھی گاتا ہے دل
کیف بن کر عالمِ ہستی پہ چھا جاتا ہے دل

اپنی ناکامی کہاں تک ہو بنائے اضطراب
اب یہ عالم ہے کہ گھبرانے سے گھبراتا ہے دل

جانتا بھی ہے فریبِ زندگانی کی بساط
پھر نہ جانے کیوں فریبِ زندگی کھاتا ہے دل

کوئی دکھ ہو، کوئی غم ہو، کوئی صدمہ ہو مگر
وہ جب آتے ہیں تو سب کچھ بھول سا جاتا ہے دل

بار ہا دیکھا ہے انجام فریبِ آرزو
اب فریبِ آرزو سے سخت گھبراتا ہے دل

کیا بساطِ عزمِ دل تیری رضا کے سامنے
کیسا جذبہ ہو اشارے پر بھلا جاتا ہے دل

داستانِ اضطرابِ دل بس اتنی ہے سلیم
جب تڑپتا ہے تو دنیا بھر کو تڑپاتا ہے دل

-------O-------

دستِ طلب نہ کر دراز، جاہ و حشم نہ کر قبول
بن نہ گدائے روسیاہ، دام و درم نہ کر قبول

خود نہ لٹا سکے اگر گوہر و لعل و سیم و زر
ننگِ خودی ہے بخششِ اہلِ کرم نہ کر قبول

شکوۂ جورِ بے کراں کر نہ کبھی یہاں وہاں
بن کے حریفِ آسماں سوزشِ غم نہ کر قبول

معرکۂ حیات میں زہر ہے خواہشِ سکوں
شورشِ زندگی سے کھیل، تلخی و ستم نہ کر قبول

زیست ہے کتنی مختصر وقفِ خزانِ غم نہ کر
لذتِ صبحِ عیش اٹھا شامِ الم نہ کر قبول

عظمتِ فقر پر نثار شان و شکوہ قیصری
چن لے عرب کی سادگی شانِ عجم نہ کر قبول

دل میں خیال ماسوا دیکھ سلیم آ نہ جائے
تو ہے خدا پرست اگر عشقِ صنم نہ کر قبول

-------O-------

زندگی بے کیف سی ہے یادِ جاناں کی قسم
دل پریشاں ہے بہت زلفِ پریشاں کی قسم

کس کو ساحل کی تمنا، کس کو ساحل کی تلاش
ہم کو ملتا ہے سکوں طوفاں میں طوفاں کی قسم

تو ہے میرے گلستانِ زندگانی کی بہار
تو ہی میری جاں ہے، میری جاں، تری جاں کی قسم

غم سے ہوتا جا رہا ہے دل کو اک گونہ لگاؤ
غم ہے اب وجۂ سکوں رنج فراواں کی قسم

اک معمّا ہے ابھی تک ہمنشیں مرگ و حیات

آدمی اب تک ہے جاہل علم و عرفاں کی قسم

گریۂ شبنم سے ہے افزونیٔ حسنِ چمن
خندۂ گل کی قسم، گل ہائے خنداں کی قسم

آدمی ہے وجہ ننگِ آدمیّت آج کل
آدمیّت کی قسم، ناموسِ انساں کی قسم

بے قراری محبت روز افزوں ہے سلیم
حسنِ جاناں کی قسم عشقِ فراواں کی قسم

-------O-------

تھا محبت کا وہ بھی اک عالم
ہم تھے رنجیدہ اور تم برہم

زندگی سے نہیں ہیں ہم مایوس
اے مرے دوست، اے مرے ہمدم

تیری نظروں میں تیرا اپنا دکھ
میری آنکھوں میں اک جہان کا غم

ہم رہیں گے خموش ان کے حضور
لیکن اپنا یہ دیدۂ پُرنم

دل کی آزردگی سلیم نہ پوچھ
ہر گھڑی ٹوٹتے ہیں تازہ ستم

دل ہے اور غم کی کائنات سلیم
ہم ہیں اور بے بسی کا اک عالم

-------O-------

بزمِ جاناں کے مے گسار ہیں ہم
مستِ صہبائے چشمِ یار ہیں ہم

دیکھنے میں ہیں زندہ دل لیکن
مرکزِ رنجِ روزگار ہیں ہم

اب خزاں کا خیال تک بھی نہیں
کتنے زارِ مئے بہار ہیں ہم

حاصلِ زندگی ہے تیرا غم
اور ترے غم کا اعتبار ہیں ہم

کوئی تسکیں، کوئی سکون نہیں
جانے کیوں اتنے بے قرار ہیں ہم

ہم سے ہے رونقِ حیات سلیم
بزمِ ہستی کے شہریار ہیں ہم

-------O-------

صورتِ نجمِ سحر سوئے سفر جائیں ہم
مژدۂ صبح سے آفاق کو بھر جائیں ہم

ہم کو ہے کتنی ہی گم گشتہ بہاروں کی تلاش
ہر طرف ہمرہِ رفتارِ نظر جائیں ہم

ہم مسافر ہی سہی، کیوں نہ چمن میں اے دل
موجۂ نکہتِ گل بن کے بکھر جائیں ہم

اے صبا جا کے درِ دوست پہ دینا دستک
خاک اگر ہو کے سرِ راہ بکھر جائیں ہم

بزمِ جاناں کہ ہے شائستۂ نغماتِ طرب
کیسے اس بزم میں بادیدۂ تر جائیں ہم

یہ نہیں وحشت و سودا و جنوں تو کیا ہے
جب چلے موجِ طرب درد سے بھر جائیں ہم

ہم کو سودا ہے کہ ہر ذرّہ ہو گلشن بکنار
باغبانوں کو یہی دھن ہے کہ مر جائیں ہم

سنتے ہیں فصلِ گل آئی ہے گلستانوں میں
کھلتے پھولوں میں کہاں خاک بسر جائیں ہم

اب تو آنسو بھی نہیں ہیں کہ ہوں نذرِ غمِ دوست
ہاں بس اک ہُو کا، بیاباں ہے جدھر جائیں ہم

دے رہے ہیں در و دیوار صدائیں ٹھہرو
اور فرمانِ جنوں ہے کہ بپھر جائیں ہم

ہمیں غم خانۂ ہستی کو بدلنا ہے سلیم
اور اگر جی سے گزرتے ہیں گزر جائیں ہم

-------O-------

یادوں کے جہاں میں کھو گئے ہم
اے حسرتِ دید لو گئے ہم

تھی شاعری میں کتنی وسعت
اک عالمِ غم ڈبو گئے ہم

ساحل کی فضا تھی خواب آلود

طوفاں کے حریف ہو گئے ہم

تھی وادیٔ زیست کتنی دلکش
ہر ایک قدم پہ کھو گئے ہم

ہر صدمۂ جاں گُسل سے اُلجھے
ہر غم میں خوشی سمو گئے ہم

آئینہ حسن بن گیا دل
خود اپنے رقیب ہو گئے ہم

تدبیر کا حوصلہ نہ پا کر
تقدیر کا رونا رو گئے ہم

چونکے تو تھے خواب زندگی سے
تھے نیند کے مارے سو گئے ہم

پھر لوٹ کے آئیں یا نہ آئیں
اک بار یہاں سے جو گئے ہم

کیا جانیے کیوں قریب آ کر
کچھ اور بھی دُور ہو گئے ہم

اب دل بھی نہیں ہے اپنے بس میں
اب دل سے بھی ہاتھ دھو گئے ہم

اپنے لئے بار ہا چمن میں
کانٹے بھی سلیم بو گئے ہم

-------O-------

اب کسی سے کیا کہیں اپنے جنوں کی داستاں
دل کی پروردہ تمناؤں کے خوں کی داستاں

لب پہ آہیں، زرد سا چہرہ، نگاہیں غم زدہ
اپنی صورت بن گئی رنجِ فزوں کی داستاں

آپ مت سنیئے گا ہم سے بھول کر رودادِ غم
سن کے کیا کیجے گا اک خوار و زبوں کی داستاں

ایک کی خاطر زمانے سے تعلق توڑنا
کس قدر دلچسپ ہے اہلِ جنوں کی داستاں

لُوٹ لی انسان نے انسانیت کی آبرو
ورنہ انسانی لبوں پر کشت و خوں کی داستاں؟

میری آنکھوں سے عیاں ہو ہی گئے آثارِ غم
اُف ! بیاں ہو ہی گئی سوزِ دروں کی داستاں

عمر بھر لُوٹے ہوں جس نے بے قراری کے مزے
اس سے کیا پوچھے کوئی دل کے سکوں کی داستاں

اب تو بیزاری ہی بیزاری ہے دنیا سے سلیم
بس بھی کر، جانے بھی دے، دنیائے دوں کی داستاں

-------O-------

گل ہوئے جاتے ہیں رخصت، دل سے اٹھتا ہے دھواں
آگ بھڑکاتی ہے رگ رگ میں فضائے گلستاں

ذرّہ ذرّہ اک سکوتِ بے کراں میں کھو گیا
کون گلشن میں کرے اب رازِ خاموشی بیاں

جانے کس کا نام لب پر آ گیا بے اختیار
بات بنتی جا رہی ہے داستاں در داستاں

گلستاں میں جانے کیوں اڑنے لگا پھولوں کا رنگ
نکہتیں جب ہو گئیں بادصبا کی رازداں

گرد بن کے برگِ گل، موجِ ہوا میں کھو گئے
ایک دن یونہی چمن میں ہم بھی ہوں گے بے نشاں

ہم تو شبنم کی خنک تابی سے بھی جلتے رہے
ہم سے ہم ہوں گے سلیم آشفتہ سر، آتش بجاں

-------O-------

میں جب حد سے زیادہ سرخوشی محسوس کرتا ہوں
تو ہمدم اپنی آنکھوں میں کمی محسوس کرتا ہوں

خلش رگ رگ میں، دل میں بیکلی، محسوس کرتا ہوں
میں جب خود میں محبت کی کمی محسوس کرتا ہوں

یہ تنہائی یہ اداسی اور یہ بیچارگی توبہ
الٰہی آج کتنی بے کسی محسوس کرتا ہوں

پھر ان کے آستاں پر جبہ سائی کر رہا ہوں میں
پھر اپنی زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں

کسی کی خشمگیں نظروں میں کیسا انقلاب آیا
کہ ان نظروں میں اک دنیا نئی محسوس کرتا ہوں

دل غمگیں نے چھیڑے ہیں کچھ ایسے درد کے نغمے

کہ ہر ذرّے کی آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں

کوئی حد ہی نہیں ہے رنج و غم کی لیکن اے ہمدم
تم آئے ہو تو کچھ تسکین سی محسوس کرتا ہوں

انہی ناکامیوں میں کامیابی دیکھتا ہوں میں
انہی تاریکیوں میں روشنی محسوس کرتا ہوں

محبت میں یہ پیہم بدگمانی بھی قیامت ہے
کہ اُن کے لطف کو بھی بے رخی محسوس کرتا ہوں

کسی صورت خلش مٹتی نہیں دردِ محبت کی
کبھی محسوس ہوتی ہے، کبھی محسوس کرتا ہوں

تصور میں سلیم اس در پہ سجدے کر رہا ہوں میں
جدائی میں بھی ان کو پاس ہی محسوس کرتا ہوں

-------O-------

دیکھ لی دنیائے فانی، فکر دُنیا کیا کریں
تابکے مہماں سرا کو اپنا گھر سمجھا کریں

آہ کو دل میں دبائیں، اشک کو روکا کریں
تم ہی سمجھاؤ جنونِ غم میں ہم کیا کیا کریں

بزم مے نوشی میں رقصاں ساغر و مینا کریں
آ کہ ہستی کا ہر اک لمحہ طرب افزا کریں

زندگیٔ جاوداں ہم بھی اگر پیدا کریں
تا ابد اے جانِ جاں تیرا ہی نظارا کریں

ہر قدم پر اک جہانِ بے بسی دیکھا کریں
پھر بھی فرماں ہے نہ تڑپیں ہم، نہ تڑپایا کریں

کیا یہی ہے زندگی اے خالقِ جاں آفریں
چند لمحے مسکرائیں، مدتوں تڑپا کریں

تیری رسوائی بھی جب اپنی ہی رسوائی ہے دوست
ہم تو رُسوا ہو چکے اب تجھ کو رسوا کیا کریں

کیوں نہ زنداں میں رہیں محوِ خیالِ کوہ و دشت
کیوں نہ ہم وحشت زدہ زندان کو صحرا کریں

موت آئے گی تو ہم لبیک کہہ دیں گے سلیم
کس لئے مرگِ سکوں پرور سے گھبرایا کریں

-------O-------

زندگانی غم ہی غم ہے، کیا علاجِ غم کریں
اس خدائی جبر پر کیا تم کرو، کیا ہم کریں

ہیں یہ سب شکوے گلے جوشِ محبت ہی کے ساتھ
کم محبت ہو تو ہم تیری شکایت کم کریں

جب کسی شے سے مسرت ہو نہیں سکتی ہمیں
تو خوشی سے کیوں نہ ہم پیدا ہزاروں غم کریں

آپ ہی کی بخششیں ہیں سب جراحت ہائے دل
آپ ہی اب کچھ علاجِ زخمِ بے مرہم کریں

درہم و برہم سہی شیرازۂ امن و سکوں
گیسوئے برہم کو وہ کچھ اور بھی برہم کریں

آ کہ پھر برپا کریں بزمِ نشاط و سر خوشی
آ کہ اپنے قہقہوں کو پردہ دارِ غم کریں

جب محبت میں خود اپنے آپ پر آتا ہو رشک
تو کسے اے دوست تیرے راز کا محرم کریں

اک نہ اک بجلی گری اپنے نشیمن پر سلیم
لٹ چکا یہ گھر بہت، اس گھر کا کیا ماتم کریں

-------O-------

سراغِ دوست کچھ کچھ پا رہا ہوں
مجھے لینا کہ کھویا جا رہا ہوں

فریبِ التفاتِ دوست توبہ
سمجھتا ہوں مگر پھر کھا رہا ہوں

رہِ ہستی کی منزل بھی ہے کوئی
بہت مدت سے چلتا جا رہا ہوں!

یہ کیا شے تُو نے نظروں سے پلا دی
بہکتا ہی بہکتا جا رہا ہوں

فریبِ دوستی کھاتا رہوں گا
فریبِ دوستی کھاتا رہا ہوں

ستاروں کی قسم اے شامِ فرقت
میں پھر آنکھوں میں آنسو پا رہا ہوں

جنوں کی کارفرمائی ہے شاید

گریباں سے الجھتا جا رہا ہوں

سلیم ان کو وفا آئے نہ آئے
مگر میں ہوں کہ دل بہلا رہا ہوں

-------O-------

سُلگ سُلگ کے تیرے غم میں جل رہا ہوں میں
فنا کے سانچے میں چپ چاپ ڈھل رہا ہوں میں

کسے ہے ہوش کہ منزل کب آئے گی لیکن
تیرے خیال میں گم ہو کے چل رہا ہوں میں

وداعِ ہوش ہے آغازِ ہوش میرے لئے
پلا پلا کے دوبارہ سَنبھل رہا ہوں میں

غمِ حبیب کی رعنائیوں میں گم ہو کر
غمِ حیات کے سانچے بدل رہا ہوں میں

اٹھائے اب نہ کوئی زحمتِ فریبِ وفا
کہ ہر فریب کی زد سے نکل رہا ہوں میں

یہ جانتا ہوں غمِ زندگی نہ دے گا ساتھ
قدم قدم پہ مگر ساتھ چل رہا ہوں میں

رواں ہے دیدۂ پرنم سے سیلِ اشک سلیم
مثالِ شمعِ فروزاں پگھل رہا ہوں میں

-------O-------

تیری نظروں کا جب اشارا پائیں
کیسے دانستہ ہم فریب نہ کھائیں

تم تو ہم کو بھلائے بیٹھے ہو
اور اگر ہم بھی تم کو بھول ہی جائیں

ہم کو بربادیوں کا رنج نہیں
آپ ہم سے مگر نظر تو ملائیں

ہم بھنور سے نکل ہی آئیں گے
اہلِ ساحل نہ اپنی بزم بڑھائیں

-------O-------

وہ کیوں ہمیں بلائیں
اے دل چلو مل آئیں

دل دور ہو گیا ہے
کیسے قریب آئیں

محفل تری سلامت
ہم آئیں یا نہ آئیں

کچھ دیر ہو سکے تو
غم کی ہنسی اڑائیں

کتنے فریب کھائیں
کتنے فریب کھائے

کیا خوب ہو کہ تم سے
ہم بھی نظر بچائیں

کچھ تم قریب آؤ
کچھ ہم قریب آئیں

مختصر سلیم کیا ہے
دیکھیں تری ادائیں

-------O-------

میکدے ہی میں یہ آداب نظر آتے ہیں
کہ دل افسردہ بھی شاداب نظر آتے ہیں

جب سے ان آنکھوں کی چھلکی ہوئی پی ہے ہم نے
ہر طرف جام مۓ ناب نظر آتے ہیں

آپ نے ہم کو جو برباد کیا، خوب کیا
آپ کیوں مضطر و بے تاب نظر آتے ہیں

خواب دیکھا تھا محبت کا مگر خواب نہ تھا
کچھ حقائق تھے جو اب خواب نظر آتے ہیں

چاند تاروں پہ نظر جا کے پلٹ آتی ہے
اپنے ہی دیدۂ بے خواب نظر آتے ہیں

سوزِ غم سے تو وہ اشکوں کا بھی دریا نہ رہا
اب کہاں وہ دُر کم یاب نظر آتے ہیں

عالی ظرفوں سے جو ہے میکدہ خالی، سو ہے
ہم سے انسان بھی نایاب نظر آتے ہیں

ہم ہیں پروانے اگرحسن کا شعلہ ہو قریب
دور سے کرمکِ شب تاب نظر آتے ہیں

کتنا اب فاصلۂ منزلِ جاناں ہے سلیم

کہ زمانے کو ظفریاب نظر آتے ہیں

-------O-------

کبھی مہیب سی راہوں سے ڈر بھی جاتے ہیں
انہی رہوں سے کبھی بے خبر بھی جاتے ہیں

تصورات کی دنیا تجھی سے ہے آباد
ہمارے ساتھ ہے تُو ہم جدھر بھی جاتے ہیں

یہ ٹھہرے ٹھہرے ہوئے سے سرشکِ غم ہمدم
یہ تارے ٹوٹ کے اکثر بکھر بھی جاتے ہیں

بنی نہ اپنی ہی تقدیر ورنہ دنیا میں
بہت ہیں جن کے مقدّر سنور بھی جاتے ہیں

وہ سخت لمحے جنہیں کاٹنا ہے سخت محال
وہ لمحے رکتے ہوئے سے گزر بھی جاتے ہیں

نہیں کہ ساری ہی آہیں اثر بھی کر جائیں
سلیم نالۂ غم بے اثر بھی جاتے ہیں

-------O-------

یہ ہم نے مانا کہ زندگی کے، کسی طرح دن گزر رہے ہیں
مگر یہ عالم ہے اپنے دل کا، کہ جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں

یہ کون یاد آ گیا کہ دل کے دبے ہوئے داغ ابھر رہے ہیں
ہزاروں گزرے ہوئے زمانے مری نظر سے گزر رہے ہیں

بنا بنا کر امید و ارماں کے نقشِ رنگین لوحِ دل پر
ہزار رنگوں سے زندگانی کے سادہ خاکوں کو بھر رہے ہیں

ابھی خزاں دور ہے چمن سے ابھی سے افسردگی سی کیوں ہے
گلوں کے اوراق کیوں ابھی سے روش روش پر بکھر رہے ہیں

بہت سے ہیں جن کی زندگی میں خوشی بھی آئی ہے، غم بھی آئے
یہ کیوں تمہارے ستم رسیدہ ہمیشہ اک حال پر رہے ہیں

سلیم جانِ حزیں ہماری سکوں سے ناآشنا ہے اب بھی
ہزاروں نشتر ہمارے دل میں اتر گئے ہیں، اتر رہے ہیں

-------O-------

اشکوں سے آستیں کو بھگوئے ہُوئے سے ہیں
پھر آج تیرے غم زدہ روئے ہُوئے سے ہیں

ہم مضمحل ہیں آج کہ تو ہے اُداس اُداس
فتنے تری نگاہ میں سوئے ہُوئے سے ہیں

ساحل تک آ گئے ہیں مگر اس کے باوجود
گرداب میں سفینہ ڈبوئے ہُوئے سے ہیں

دنیا کا ہے خیال، نہ عقبیٰ کی فکر ہے
کیا جانے کس خیال میں کھوئے ہُوئے سے ہیں

کیا تجھ کو ہے کسی نئے بسمل کی پھر تلاش
دامن کے جتنے داغ ہیں دھوئے ہُوئے سے ہیں

کتنے ہی پھول کتنی ہی کلیاں، چنیں مگر
رگ رگ میں نوکِ خار چبھوئے ہُوئے سے ہیں

ٹھہرے ہوئے سے ہیں سرِ مژگاں شریکِ غم
لعل و گہر تظر میں پروئے ہُوئے سے ہیں

ماضی کے حادثات، محبت کے واقعات
غم بن کے میرے دل میں سموئے ہُوئے سے ہیں

سرمستئ نشاط کا عالم تو ہے سلیم
لیکن جہانِ درد میں کھوئے ہوئے سے ہیں

-------O-------

سعئ سکوں سے دردِ فراواں نہ ہو کہیں
یوں تلخئ حیات نمایاں نہ ہو کہیں

سمجھے ہوئے ہیں ہم جسے صحرائے بیکراں
وہ بھی بقدرِ وسعتِ زنداں نہ ہو کہیں

رگ رگ میں ایک آگ سی بھڑکی ہوئی ہے آج
پھر مہربانئ غمِ جاناں نہ ہو کہیں

یا یہ بہارِ لالہ و گل جاوداں رہے
یا یہ چمن نہ ہو یہ بہاراں نہ ہو کہیں

عشقِ نہاں ہے کفر تو پھر کفر ہی سہی
لیکن یہ کفر حاصلِ ایماں نہ ہو کہیں

پھر عیشِ بے حساب میں کھوئے ہوئے ہیں ہم
پھر دردِ بے پناہ کا ساماں نہ ہو کہیں

کر تو رہے ہو شکوۂ دوراں مگر سلیم
ڈر ہے کہ بارِ خاطرِ جاناں نہ ہو کہیں

-------O-------

جنونِ شوق، نہیں سوزِ جاں گداز نہیں

خطا معاف، وہ لطفِ نیاز و ناز نہیں

اگر جہاں میں محبت گناہ ہے واعظ
تو پھر خدا کی قسم کوئی پاک باز نہیں

وہ کون ہے جو محبت میں چُور چُور نہ ہو
نگاِ ناز کی کس دل پہ ترک تاز نہیں

نماز تو ہے سراپا نیاز ہو جانا
بجز نیاز مکمّل تری نماز نہیں

یہ اک ادائے جنوں سازِ حسن ہے ورنہ
کسی کے حال سے غافل نگاہِ ناز نہیں

یہ کس کے جلوے ہیں کون و مکاں پہ چھائے ہوئے
اگر تجلّیٔ حسنِ کرشمہ ساز نہیں

سلیم یہ بھی خرد ہی کی کم نگاہی ہے
وگرنہ حسن و محبت میں امتیاز نہیں

-------O-------

شاکیٔ قسمت کبھی ہم سوختہ ساماں نہیں
گو سراپا درد ہیں منّت کشِ درماں نہیں

آج اہلِ دل کی ہمت آزمائی جائے گی
سامنے طوفاں ہے اور اندازۂ طوفاں نہیں

جان کر بھی عشق میں کھانا ہی پڑتا ہے فریب
تو جنہیں نادان سمجھا وہ کوئی ناداں نہیں

کس غضب کی ڈال دیں اے دوست تو نے الجھنیں
زندگی آساں نہیں تو موت بھی آساں نہیں

دامنِ مژگاں میں تو نے کیا چھپا رکھا ہے دوست
دل میں اک پیکاں سا چبھتا ہے مگر پیکاں نہیں

آ سلیمِ غم زدہ تجدیدِ مے نوشی کریں
جز شرابِ تلخ علاجِ تلخیِ دوراں نہیں

-------O-------

شکوہ طرازیِ ستم آسماں نہیں
دلِ پائمالِ غم سہی لب پر فغاں نہیں

گو عرضِ حال کی مجھے تاب و تواں نہیں
تو جس کو سن سکے وہ مری داستاں نہیں

دل کا ہر ایک راز نظر سے نہاں نہیں
آنکھیں زُباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

ہوتی رہیں حجاب یہی کم نگاہیاں
ورنہ تجلیٔ رخِ جاناں کہاں نہیں

دنیا میں دردِ عشق غمِ جاوداں تو ہے
مانا غمِ حیات غم جاوداں نہیں

ناصح، جنونِ عشق میں کیا مصلحت کا دخل
اک جان کا زیاں ہے سو کوئی زیاں نہیں

رُخ سے کسی نے پردۂ حائل ہٹا دیا!
اب جز نگاہ شوق کوئی درمیاں نہیں

مصروفِ سجدہ ہائے مسلسل ہے کیوں سلیم
یہ جلوہ گاہِ حشر ہے کُوئے بتاں نہیں

-------O-------

پسِ نگاہ ہے کیا، ظالموں کے بس میں نہیں
جو ہم قفس میں ہیں، فکر و نظر قفس میں نہیں

ہوئے ہیں پابہ سلاسل جو ہم تو کیا غم ہے
کمی تو قافلۂ عشق کے جرس میں نہیں

اُٹھی ہے گلشنِ ہستی میں سرخ سرخ آندھی
جو روک پائے مجال ایسی خار و خس میں نہیں

-------O-------

بہ جبر لب پہ جب آئے ہنسی، ہنسی تو نہیں
کمال سعیٔ مسرت شگفتگی تو نہیں

وہ عرضِ حال پر ان کا خموش رہ جانا
کرم نہیں ہے نہ ہو، کوئی بے رخی تو نہیں

خوشی خوشی سے ترا غم کیا ہے ہم نے قبول
وگرنہ عیش و مسرت کی کچھ کمی تو نہیں

سنبھل سنبھل، نہ محبت کو اک مذاق بنا
یہ نقدِ جان کی بازی ہے، دل لگی تو نہیں

اگر یقیں ہو تو بگڑی سنور بھی سکتی ہے
خدا کی مار ہے لیکن یقین ہی تو نہیں

ترے بغیر بھی گل مسکرا رہے ہیں مگر

وہ دلکشی تو نہیں ہے، وہ تازگی تو نہیں

ہوا ہوں تجھ کو بھلانے پر آج آمادہ
مرے جنوں کی کہیں حدِ آخری تو نہیں

جبینِ شوق جھکانا کسی کے در پہ سلیم
لوازماتِ محبت فقط یہی تو نہیں

-------O-------

اپنے قابو میں دل رہا بھی نہیں
تابِ اظہارِ مدّعا بھی نہیں

حسن کو اب سرِ جفا بھی نہیں
ہائے اتنا سا واسطا بھی نہیں

جو ترے غم سے بچ گیا اے دوست
وہ بہت دن تلک جیا بھی نہیں

کل تلک غم کا آسرا تھا مگر
آج تو غم کا آسرا بھی نہیں

اتنے سجدے کئے تری راہ میں !
کہ ترا نقش پا رہا بھی نہیں

یونہی بربادیوں کا شکوہ ہے
ورنہ تجھ سے کوئی گلا بھی نہیں

جانتا ہے جسے زمانہ سلیم
وہ ہمیں آج تک ملا بھی نہیں

-------O-------

تجھے گلہ کہ محبت سے مجھ کو مس ہی نہیں
مجھے یہ فکر کہ کیوں زندگی میں رس ہی نہیں

فلک بھی عظمتِ انساں کے گیت گاتا ہے
یہ مت کہو کہ ستاروں پہ دسترس ہی نہیں

اُبھارتا ہے جو پسِ ماندگانِ منزل کو
نویدِ قربتِ منزل بھی ہے جرس ہی نہیں

ہمیں حیات کی موجیں، ہمیں ہیں بحرِمات
ہماری زیست فقط ایک دو نفس ہی نہیں

قدم قدم پہ گلستاں میں بچھ رہے ہیں دام
قفس ہیں اور بھی صیاد کا قفس ہی نہیں

مذاقِ دید پہ ہے منحصر، وگرنہ سلیم
چمن میں بلبل و گل بھی ہیں خار و خس ہی نہیں

-------O-------

حُسن کا حربہ نگاہِ دل نشیں تک ہی نہیں
اور بھی کتنی ادائیں ہی یہیں تک ہی نہیں

لُطفِ سجدہ تو سراپا سجدہ بن جانے میں ہے
سر سے پا تک سجدہ بن، سجدہ جبیں تک ہی نہیں

کتنی آہیں ہیں جو گھُٹ کر دل میں رہ جاتی ہیں دوست
بیکسوں کی آہ، آہِ آتشیں تک ہی نہیں

آدمی چاہے تو دُنیا کو بنا ڈالے بہشت !
عیشِ بے اندازہ فردوسِ بریں تک ہی نہیں

کس قدر انکار ہیں اقرار کی صورت لئے
حُسن کا انکار وابستہ نہیں تک ہی نہیں

تیرے آگے خُوبیِ حُور و ملائک مات ہے
"بے نظیری" تیری کچھ روئے زمیں تک ہی نہیں

میری رگ رگ میں خلش محسوس ہوتی ہے سلیم
اب محبت کی خلش دل کے قریں تک ہی نہیں

-------O-------

وہ نگاہِ شوق سے کچھ دُور ہو سکتے نہیں
لاکھ پردوں میں چھپیں مستُور ہو سکتے نہیں

تیرا غم کیا مل گیا گویا دو عالم مل گئے
دو جہاں کھو کر بھی اب رنجُور ہو سکتے نہیں

داغ رہ رہ کر ابھرتے ہیں دل ناشاد کے
ہمنشیں کیا دُور یہ ناسور ہو سکتے نہیں

ان کی نظروں سے جنھوں نے پی ہے وہ مدہوشِ عشق
بادۂ گلرنگ سے مخمور ہو سکتے نہیں

یہ تو مانا عشق میں مجبور ہیں، لاچار ہیں
پھر بھی تم چاہو تو ہم مجبُور ہو سکتے ہیں

جو کسی کے غم اٹھانے میں ہمیشہ شاد ہوں
وہ مسرت پا کے بھی مسُرور ہو سکتے نہیں

ہمنشیں جب سایۂ نورِ حقیقت ہے مجاز

سائے، سائے ہی رہیں گے، نُور ہو سکتے ہیں

دیکھ لیتے ہیں انہیں دل کی تجلی گاہ میں
ہم گدائے جلوہ زارِ طُور ہو سکتے نہیں

کھینچ لائے ہیں انہیں بزم تصور میں سلیم
ہم کہیں بھی ہوں مگر مجبُور ہو سکتے نہیں

-------O-------

مری نظر سے نظر ملاؤ، کچھ اور میرے قریب آؤ
مرے قوی بازوؤں کے حلقوں کو، چھوڑ کر اب کہیں نہ جاؤ

حصار امن و امان ہوں میں، بہار کا پاسبان ہوں میں
تمہیں خزاؤں کا خوف کیوں ہے، بہار بن بن کے مسکراؤ

میں آہنی عزم کے سہارے، وفا کی وادی میں گامزن ہوں
مگر کہیں تم نہ لڑکھڑاؤ، مگر کہیں تم نہ ڈگمگاؤ

ہم اہل دنیا کی حاسدانہ قیود کو توڑ توڑ دیں گے
مرے ارادوں کی ڈھال لے لو، میرے قدم سے قدم ملاؤ

خنک خنک چاندنی سے بڑھ کر، تمہارے جلوے ہیں روح
پرور
حنائی ہاتھوں سے چاند جیسے، حسین چہرے کو مت چھپاؤ

-------O-------

زندگی تلخ ہے تو مت گھبراؤ
تلخیوں کو ہی خوشگوار بناؤ

عیشِ رفتہ کی کوئی یاد دلاؤ
کوئی بھولا ہوا فسانہ سناؤ

باتوں باتوں میں بڑھ نہ جائے کبھی
طول دے دے کے بات کو نہ بڑھاؤ

اپنی نظریں نہ بار بار جھکاؤ
وقت بھر دے گا میرے دل کے گھاؤ

ایسے درویش پھر نہ آئیں گے
اپنی محفل سے ہم کو یوں نہ اٹھاؤ

زیست پر چھا گئی ہے تاریکی
زلفِ شبگوں کو اپنے رخ سے ہٹاؤ

زندگی کس قدر اداس ہے آج
دوستو دکھ بھرے ترانے نہ گاؤ

ہم تو شعلوں سے کھیلتے ہی رہے
اپنا دامن جو ہو سکے تو بچاؤ

غمِ دوراں ہے یا غمِ جاناں
دل میں جیسے دھک رہا ہے الاؤ

بڑھ چلیں ظلمتیں بہت غم کی
آرزوؤں کے پھر چراغ جلاؤ

کتنے ناکام ہیں سلیم یہاں
اپنی ناکامیوں کو بھول بھی جاؤ

-------O-------

آستینوں میں نہاں خنجرِ براں رکھو

میں جو ہوشیار رہوں مجھ کو منافق کہہ دو

لاؤ منصوبۂ زندان و سلاسل کوئی
میں جو اس جال کو توڑوں مجھے عیّار کہو

میٹھے الفاظ کی ہر تہہ میں بھرو زہرِ عناد
خبثِ باطن کا مگر مجھ پہ ہی الزام دھرو

روسیاہ ہوں، مجھے دو سرخیٔ رو کا طعنہ
شفقِ صبح کی سرخی سے بھی تم خوف کرو

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، پھر بھی ہر دم
ظلمتِ راہ کو تابانیٔ خورشید کہو

-------O-------

کہیں یہ بات بھی اے دوست ناگوار نہ ہو
مگر میں کیا کروں جب تجھ پہ اعتبار نہ ہو

مجھے قرار انہی بے قراریوں میں ہے
مرے سکوں کے لئے کوئی بے قرار نہ ہو

مخالفت سے طبیعت کا جوش اُبھرتا ہے
وہی فضا ہے مناسب جو سازگار نہ ہو

مری نگاہ میں وہ عشق ہی نہیں ہمدم
جو مٹ سکے، جو زمانے میں پائیدار نہ ہو

وہ داغ دل کہ جو مٹنے سے مٹ سکا نہ کبھی
ہمارے عہدِ محبت کی یادگار نہ ہو

جب ان کو پیار سا آئے ہماری وحشت پر
تو کس لئے ہمیں اپنے جنوں سے پیار نہ ہو

جو سہہ رہا ہوں اسے جی ہی جانتا ہے سلیم
مری طرح سے کوئی محوِ انتظار نہ ہو

-------O-------

ہر خموشی تھی فغاں، ضبطِ فغاں کے ساتھ ساتھ
سو زُبانیں ہیں زبانِ بے زباں کے ساتھ ساتھ

چار دن بے فکر و اندیشہ نہ گزرے ہمنشیں
موت کا کھٹکا رہا عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ

رفتہ رفتہ ایک دن طے ہو ہی جائے گا سفر
چل رہے ہیں زندگی کے کارواں کے ساتھ ساتھ

دکھ اٹھا کر بھی کسی کو دکھ نہ پہنچایا مگر
لاکھ دشمن ہیں ہجومِ دوستاں کے ساتھ ساتھ

ہر قدم اپنی روش، اپنا طریق، اپنا خیال
اپنی دُنیا میں رہے ہم اس جہاں کے ساتھ ساتھ

بے سبب چھیڑی نہیں ہم نے جہاں کی داستاں
رازِ دل کہتے رہے ہیں دوستاں کے ساتھ ساتھ

تیرے آنے سے مسرت اشکِ غم میں ڈھل گئی
ہے تبسم بھی مرے اشک رواں کے ساتھ ساتھ

ہم بہارِ بے خزاں کی جستجو میں ہیں سلیم
ہم نہ بدلیں گے فضائے گلستاں کے ساتھ ساتھ

-------O-------

جب بھی بکھرا گلوں کا شیرازہ
کِھل اُٹھے کتنے ہی گلِ تازہ

اب بھی ہے تیری یاد رونقِ زیست
اب بھی ہے باز دل کا دروازہ

اشکِ غم کون روک سکتا ہے
عشرتوں کا یہی ہے خمیازہ

دل کی گہرائیوں میں اُترے کون
کس کو ہے کس کے غم کا اندازہ

دل کی آواز پر چلے ہیں ہم
کیوں کسے کوئی ہم پہ آوازہ

خونِ دل سے ہے زندگی کی نمود
روئے ہستی کا ہے یہی غازہ

ہم کو خود بھی سلیم ہو نہ سکا
اپنی محرومیوں کا اندازہ

-------O-------

دلفریب تھی کتنی دشمنوں کی عیّاری
با رہا چھپی دل میں دوستوں کی غم خواری

کب تک ریا کاروا عتمادِ مکاری
چاک ہو ہی جاتا ہے پردۂ ریا کاری

انتہائے نشہ ہے، انتہائے خمیازہ

اے ستم گرو روکو، شغلِ مردم آزاری

آج جلتی آنکھوں میں شعلے سے بھڑکتے ہیں
تو ہے یا ہے آنکھوں میں عکسِ گل کی گلکاری

بار ہا محبت پر وہم کا گماں گزرا
بار ہا حقیقت کو سمجھے خواب بیداری

اک نہ اک نیا نشتر بات بات میں پنہاں
پھر بھی ہے حریفوں کو ادعائے دلداری

دل اُچاٹ سا کیوں ہے زندگی کی ہر شے سے
اپنے آپ سے بھی ہے مدتوں سے بیزاری

-------O-------

پلا دے زہر نہیں جبکہ انگبیں ساقی
کہاں تک اشک کریں جذبِ آستیں ساقی

لگا دے آگ جو غم کے نہان خانے میں
عطا ہو مجھ کو وہی جامِ آتشیں ساقی

کوئی تو بات ہے ہم فرش کے مکینوں کی
کہ رشک کرتے ہیں سب عرش کے مکیں ساقی

میں اور ان کو بھلا دوں مری مجال کہاں
میں اور ترکِ محبت نہیں نہیں ساقی

کہاں کہ دردِ مجسم تھا دل محبت میں
کہاں کہ درد ہے لیکن کہیں کہیں ساقی

زمانہ مائلِ بغض و حسد سہی لیکن
ہمارے دل میں نہیں کوئی بغض و کیں ساقی

ہزار سجدے کئے دل ہی دل میں ہم نے مگر
کسی کے در پر جھکائی نہیں جبیں ساقی

ترا سلیم غزل خواں ہے بزم میں امشب
وہ تیرا رند، پرستارِ اولیں ساقی

-------O-------

ترے بغیر فضا سازگار ہو نہ سکی
تلافئ ستمِ روزگار ہو نہ سکی

سکوت ہی میں رہی گم حکایتِ شبِ غم
مری نگاہ سے بھی آشکار ہو نہ سکی

نہ پوچھ فتنۂ محشر جگا گئی کیا کیا
وہ اک نظر جو مرے دل کے پار ہو نہ سکی

-------O-------

غزل ہے سینہ زنی میر کی، نہ فانی کی
غزل صدا ہے محبت کی ہم زبانی کی

کنارے لگ کے سسکتی ہے موج بھی کیا کیا
اسی تڑپ میں کہ فرصت ہو پھر روانی کی

اسی میں ہے رمِ آہو کا سا قرار و فرار
جس اضطراب نے چاہت کی ترجمانی کی

عجب بہار ہے رخسار پر برنگِ حیا
عجیب لہر ہے یہ لذتِ جوانی کی

-------O-------

عشرتِ زندگی کہاں نہ ملی
غم کے ہاتھوں مگر اماں نہ ملی

سہہ چکے ہر عذابِ ناکامی
راحتِ مرگِ ناگہاں نہ ملی

شرحِ غم اہل غم سے ہو نہ سکی
ایک سے ایک داستاں نہ ملی

جو گنوا دی تری محبت میں
پھر وہی عمرِ رائیگاں نہ ملی

کس کو معلوم دل پہ کیا گزری
فرصتِ آہ بھی جہاں نہ ملی

عمر بھر تیری آرزو کرتے
فرصتِ شوقِ بے کراں نہ ملی

جذبۂ عشق جاوداں تھا سلیم
گو ہمیں عمرِ جاوداں نہ ملی

-------O-------

منتشر ہیں مری آہوں کے شرارے اب بھی
میری پلکوں پہ لرزتے ہیں ستارے اب بھی

اب بھی گردابِ بلا گھیرے ہوئے ہے مجھ کو
نظر آتے ہیں نگاہوں کو کنارے اب بھی

جانِ من تیرا سہارا ہو میسر کہ نہ ہو

ڈھونڈتا ہے دلِ مایوس سہارے اب بھی

آج بھی تیری نگاہوں کا اثر باقی ہے
میری رگ رگ میں ہیں پُر سوز شرارے اب بھی

آج بھی عہدِ محبت کا خیال آتا ہے
ذہن میں گھوم رہے ہیں وہ نظارے اب بھی

-------O-------

آشیانے کے مقابل، آشیاں سے دُور بھی
بجلیاں ہیں گلستاں ہیں، گلستاں سے دُور بھی

ایک ہی حسنِ حقیقت ہے یہاں ہو یا وہاں
عالم ہستی میں بھی، کون و مکاں سے دُور بھی

منحصر ہے جذبۂ بے اختیارِ شوق پر
یعنی منزل پاس بھی ہے، کارواں سے دُور بھی

وہ جہاں بھی ہوں وہیں پر سجدہ ہائے شوق کر
آستانے سے قریب اور آستاں سے دُور بھی

یوں قفس کو گلستاں میں رکھ دیا صیّاد نے
گلستاں میں بھی رہے ہم گلستاں سے دُور بھی

پے بہ پے صدمے اٹھا کر، زندگانی میں سلیم
کوئی رہ سکتا ہے کیا، آہ و فغاں سے دُور بھی

-------O-------

اے دلِ آزردہ ترکِ غم بھی ہو جائے کبھی
اہتمامِ فکر بیش و کم بھی ہو جائے کبھی

ایک ہی سُر میں سرودِ زندگی گا کر نہ دیکھ
نغمۂ ہستی میں زیر و بم بھی ہو جائے کبھی

اُف سکوتِ مستقل ہر آرزو کے خُون پر
یہ خموشی تابکے ماتم بھی ہو جائے کبھی

چھوڑ کر ذکرِ تبسم ہائے گُل ہائے چمن
کوئی ذکرِ گریۂ شبنم بھی ہو جائے کبھی

دل نے ہنس ہنس کر اٹھائے ہیں بہت رنج و الم
رنج ہی کیا ہے جو غم کا غم بھی ہو جائے کبھی

خُوب ہے بے غم سا رہنا زندگانی میں سلیم
خوب تر ہے چشم گر پرنم بھی ہو جائے کبھی

-------O-------

کبھی ہیں گریاں، کبھی ہیں خنداں، کبھی ہے غم تو کبھی خوشی بھی
ہزار رنگوں میں رنگ دیتی ہے زندگی کی ہما ہمی بھی

کچھ اس طرح سے گزر رہی ہے کچھ اس طرح سے گزر گئی بھی
کہ ہم نے رو رو کے شام کر دی، جو صبح شامِ الم ہوئی بھی

وہ آج اس طرح یاد آئے، کہ دل کو غم بھی ہے اور خوشی بھی
کرم بھی یاد آ رہے ہیں ان کے، نظر میں ہے ان کی برہمی بھی

ثباتِ غم کو نہیں میسر، تو عارضی ہے شگفتگی بھی
ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے، مرا الم بھی، تری خوشی بھی

ہیں جتنے خم سب کے سب پلادے، شراب خانے میں مے بہادے
جب آج پینے پر آ گئے ہیں، تو کیوں نہ پی لیں رہی سہی بھی

بچھڑ گئے جب تو یاد آیا، بچھڑ ہی جانا تھا ہم کو اک دن
ہم اس طرح سے جدا بھی ہونگے، یہ دل نے سوچا نہ تھا کبھی بھی

وہی ہے جانِ قرار و تسکیں، کہ جس نے صبر و قرار لوٹا
غمِ محبت تری دہائی، کہ رہزنی بھی ہے رہبری بھی

حدودِ منزل سے بڑھ گئے ہیں، خیالِ منزل میں بار ہا ہم
سلیمؔ منزل بکف رہی ہے، ہماری ہر ایک گمرہی بھی

-------O-------

میری نظروں میں مری منزل رہی
دل بھٹکتا تھا بڑی مشکل رہی

تم بھی ہم سے کتنے بیگانہ رہے
زندگی بھی کتنی بے حاصل رہی

وجہِ دُوری تیری خودبینی بھی تھی
میری خودداری بھی کچھ حائل رہی

کیسے کیسے وسوسے پیدا ہوئے
دل سے جب تیری نظر غافل رہی

بزم دل ہے آج گر سونی تو کیا
مدتوں آباد یہ محفل رہی

کچھ محبت بھی رہی محشر خرام
کچھ تمنا بھی عذابِ دل رہی

کچھ حسینوں سے گریزاں بھی رہے

کچھ طبیعت بھی ادھر مائل رہی

رنجِ ماضی سے ملی فرصت تو پھر
ہم کو فکرِ حال و مستقبل رہی

پے بہ پے صدمے سہے ہم نے سلیم
جانِ مضطر عمر بھر گھائل رہی

-------O-------

باہر کی سمت جا کے نظر لوٹتی رہی
سسکی جو لی ہوا نے تو جاں پر بنی رہی

اک جانِ ناتواں کو اداؤں نے دھر لیا
پھر دیر تک حسین لبوں پر ہنسی رہی

دُنیا وہی ہے، کوچہ و بازار بھی وہی
تو نے جو مجھ کو چھوڑ دیا کا کمی رہی

-------O-------

ہر تمّنا عذاب ہو کے رہی
زندگانی خراب ہو کے رہی

نگۂ اشتیاق کیا کہنا
آخرش کامیاب ہو کے رہی

اللہ اللہ فزوئیِ بے داد
ایک دن بے حساب ہو کے رہی

مستیٔ چشم ناز کیا کہنا
رشکِ جامِ شراب ہو کے رہی

حسن نے جو نگاہ کی دل پر
جانِ صد اضطراب ہو کے رہی

ہر ادائے خرد شکن تیری
دہر میں لاجواب ہو کے رہی

ہم سے چھپتی کہاں تجلیٔ دوست
ہر طرف بے نقاب ہو کے رہی

اللہ اللہ تری محبت میں
ایک دنیا خراب ہو کے رہی

نگہٗ التفاتِ دوست سلیم
عشرتِ بے حساب ہو کے رہی

-------O-------

فقط نہ سعیٔ مسرت خراب ہو کے رہی
ستم تو یہ ہے کہ وجہٗ عذاب ہو کے رہی

خرابِ الفتِ جاناں کچھ ایک ہم ہی نہ تھے
تمام محفلِ ہستی خراب ہو کے رہی

وہ پہلی پہلی نظر جس نے دل کو لُوٹ لیا
وہی نگاہ خود اپنا جواب ہو کے رہی

کہاں کہاں تھا نگاہوں سے کوئی پوشیدہ
قدم قدم پہ نظر کامیاب ہو کے رہی

شراب بن کے رگ تاک میں ہوئی پنہاں
گھٹا سے بوند جو ٹپکی شراب ہو کے رہی

ہزار پردہ بہ پردہ سہی تجلیٔ دوست
حجاب رہ نہ سکے بے حجاب ہو کے رہی

اٹھی تھی موجِ مسرت جو گوشۂ دل میں
ہزار حیف کہ موجِ سراب ہو کے رہی

سلیم ہم کو جہنم قبول تھا لیکن
نوازشِ کرم بے حساب ہو کے رہی

--------O-------

ہر موجِ بحر، غیرتِ گرداب ہو گئی
کشتی کچھ ایسے ڈھنگ سے غرقاب ہو گئی

ان کے حضور سرخیٔ چشمِ گہر فشاں
افسانہ ہائے دیدۂ بے خواب ہو گئی

کب تک تلاشِ جنسِ وفا، اب وفا کہاں
عنقا کی طرح دہر میں نایاب ہو گئی

تجھ کو قسم ہے دوست محبت کی قدر کر
یہ جنسِ لازوال بھی کمیاب ہو گئی

جو زندگی پیامِ مسرت بنی رہی
کیوں گردش فلک وہ بھی اک خواب ہو گئی

دیکھا کچھ اس نگاہ سے تو نے مری طرف
جو آرزو تھی ماہیٔ بے آب ہو گئی

ان کی نگاہِ لطف کے اعجاز سے سلیم

ہر کشتِ آرزو مری شاداب ہو گئی

-------O-------

ہر اُمید و خوفِ فردوس و جہنم چھوڑ دے
کر رضائے دوست فکر شادی و غم چھوڑ دے

دو جہاں دے کر بھی مل جائے اگر دیدارِ دوست
پھر تقاضائے محبت ہے دو عالم چھوڑ دے

درہم و برہم سہی شیرازۂ امن و سکوں
زُلف برہم کو مری جاں اور برہم چھوڑ دے

زندگی کے عیش و غم ہیں امتیازاتِ نگاہ
سازِ عشرت چھیڑ دے، افسانۂ غم چھوڑ دے

فکرِ بیش و کم بھی غم ہے دشمنِ جان و سکوں
ہو سکے تو فکر ہائے بیش اور کم چھوڑ دے

شکوہ بے حاصل، بے فائدہ گلہ ان کے حضور
دل خیالِ شکوہ ہائے جورِ پیہم چھوڑ دے

دولتِ فقر و غنا کیا ہے، متاعِ لازوال
دھوپ چھاؤں ہے شکوہ و شوکتِ جم چھوڑ دے

دوست اب تک آ رہے ہیں زخمِ کاری کے مزے
سعی تسکیں چھوڑ دے، غم ہائے مرہم چھوڑ دے

دیدۂ پرنم تجھے اب لے کے ڈوبے گی سلیم
بھول جا رنج فراواں، چشمِ پُرنم چھوڑ دے

-------O-------

جب کبھی پھیل گئے اندھیارے
سرِ مژگاں اتر آئے تارے

آپ اپنے پہ بھروسا نہ رہا
اجنبی نکلے جو اپنے پیارے

یوں خرابات سے دامن نہ بچا
زندگی کے ہیں یہی گہوارے

جو کبھی دل میں اتر جاتے تھے
دل میں چبھتے ہیں وہی انگارے

تیری بیگانہ مزاجی کے سبب
حوصلے ٹوٹ گئے ہیں سارے

دل مسرت سے ہے محروم سلیم
یوں تو ہنس لیتے ہیں غم کے مارے

-------O-------

لطف کیا ملے گا اب حالِ دل سنانے سے
جو گزر گئی دل پر تیرے مسکرانے سے

اس نے آزما کر بھی ہم کو باوفا پایا
جس کو بے وفا پایا ہم نے آزمانے سے

نیند اگر نہ آ جاتی، موت اگر نہ پا جاتی
حشر تک نہ اٹھتے ہم تیرے آستانے سے

تھرتھری سی لہجے میں کپکپی سی ہونٹوں پر
اور بھی نمایاں ہے دردِ دل سنانے سے

ہر کلی ہے پژمُردہ، گلستاں ہے افسردہ
اک ہمیں نہیں غمگیں آپ کے نہ آنے سے

اک نشہ سا طاری ہے روح کی فضاؤں پر
کتنی مستیاں بکھریں عشق کے فسانے سے

دل کی بے قراری کا اب سلیم کیا کیجے
جس نے ہم کو لوٹا ہے نت نئے بہانے سے

-------O-------

سرشکِ غم کی زباں سے کب تک، بیان دردِ نہاں کرینگے
زبانِ خاموش سے کہاں تک، غمِ محبت بیاں کرینگے

ابھی تو یارائے ضبط باقی ہے جاں نثاروں کو غم دیئے جا
ابھی تو ہوش و خرد ہے باقی تمہارا شکوہ کہاں کرینگے

بس اک جھلک کے عوض بھی کوئی اگر متاعِ حیات چاہے
تو اس کے قدموں پہ ہم نچھاور بصد خوشی نقدِ جاں کرینگے

بہار میں کھیلتے رہے ہم، بہار کی دلفریبیوں سے
خزاں جب آئے گی گلستاں میں خزاں سے دل شادماں کرینگے

رہِ محبت پہ چلنے والے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا
بڑھا بڑھا کر جہان والے ہزار باتیں یہاں کرینگے

چمن میں پابندیٔ نشیمن یہ ایک قیدِ قفس ہے ہمدم
ہم اپنی فطرت کو بے نیازِ ضرورتِ آشیاں کرینگے

اسی سے لطفِ سرورِ ہستی، صنم پرستی، صنم پرستی

سلیم جب تک ہے جان باقی طوافِ کوئے بتاں کرینگے

-------O-------

ہے زندگی تو پھر ترے کرم کا لطف اٹھائیں گے
خوشی میں جھوم جھوم کر خوشی کے گیت گائیں گے

قدم قدم غم و الم کو ٹھوکریں لگائیں گے
کوئی بھی سنگِ راہ ہو خیال میں نہ لائیں گے

تمام پستیوں کو رفعتوں سے دیں گے ہم بدل
اس آسماں سے ہٹ کے اور اک آسماں بنائیں گے

ہے داغ داغ دل مگر چمک اٹھے گی رہ گزر
چراغ بن کے ظلمتوں کی زد میں جگمگائیں گے

ہمارے حوصلے بہت تم آزما چکے مگر
جو ہو سکا تمہاری ہمتوں کو آزمائیں گے

-------O-------

آہوئے دشت کی مانند رم آثار لگے
وہ جو خود میری محبت کا طلب گار لگے

بات کرنے کے سے انداز میں کھولے لبِ ناز
نوکِ انگشت بہ لب مائلِ انکار لگے

یا خدایا یہ محبت ہے مصیبت کیسی
یہی کہتے ہوئے سینے سے وہ ہر بار لگے

یوں ملاتا ہے نگاہیں کہ رہے دل مجبور
پیار اس طرح سے دیتا ہے کہ بیزار لگے

جائزہ لے میری خوابید تمناؤں کا
میرے افکار کی دنیاؤں کا سیّار لگے

معنیٔ وصل سمجھنے سے گریزاں لیکن
شوخیٔ طبع رسا محرمِ اسرار لگے

تیکھے ہونٹوں پہ وہ موہوم تبسم کا فسوں
خوں میں ڈوبی ہوئی چلتی ہوئی تلوار لگے

ساتھ ہو جب تو بیاباں بھی گلستاں بن جائے
خار ہو راہ میں تو سبزۂ بیدار لگے

ہوں نہ یوسف، نہ زلیخا کا خریدار سلیم
کوچۂ درد بھی کیوں مصر کا بازار لگے

-------O-------

دل نوازی کی ادا پھر بھی دل آزار لگے
اپنی معصوم نگاہی میں پُراسرار لگے

میرے افلاس کو دے طعنۂ ثروت ہنس کر
تو نفس ٹوٹتے پیمانے کی جھنکار لگے

بند گیسو تو وہ کھولے، نہ قبا کو کھولے
منزلِ شوق نہ آسان نہ دشوار لگے

امتحاں لے جو مرے حوصلہ و ہمت کا
میری پامالیٔ دل کے لئے خود دار لگے

مجھ کو دکھلائے محبت کے ہزاروں پہلو
لیکن آمادگیٔ وصل سے بیزار لگے

غم کے کتنے ہی پہاڑوں کو دھنک بھی ڈالا
سنگریزے بھی مگر راہ میں دیوار لگے

رقص میں آئے ہوئے موجِ ہوا سے پودے
بار ہا رات کی تاریکی میں کہسار لگے

سادگی اپنی ہے یا اہلِ تصنع کا کمال
دشمنِ جاں بھی ہمیں مونس و غم خوار لگے

-------O-------

عجب کارِ نمایاں کرتے جاتے ہیں جہاں والے
نہ جانے دل میں کیا کیا کہہ رہے ہیں آسماں والے

ادھر ہم ہیں، قفس ہے اور یادِ آشیانہ ہے
ادھر بجلی کے ڈر سے دم بخود ہیں آشیاں والے

خوشی فانی ہے، غم فانی ہے، تم فانی ہو، ہم فانی
جہاں میں مل نہیں سکتے حیاتِ جاوداں والے

جہاں فریاد لب تک آتے آتے ڈگمگاتی ہے
نظر سے کام لیتے ہیں وہاں خاموشیاں والے

نہ جانے کب، کہاں، کیسے، پہنچ جائیں گے منزل پر
بہر صورت رواں ہیں زندگی کے کارواں والے

محبت نے بڑھایا مرتبہ سارے ملائک سے
خدا سے کس قدر نزدیک تر ہیں ہم جہاں والے

یہ اہلِ فن کی بے قدری، یہ نااہلوں کی سرداری
ہنر والے نہ مٹ جائیں کہیں اے لامکاں والے

سلیم اب اہلِ دل کب تک بچائے جائیں دل اپنا
جہاں دیکھو وہیں ملتے ہیں حسنِ دلستاں والے

-------O-------

کسی ویرانے میں تسکینِ دلِ زار ملے
اپنے سایہ سے کوئی سایۂ دیوار ملے

دل اگر تیرا حقیقت میں ہے اخلاص طلب
میری آغوش میں آ تاکہ تجھے پیار ملے

جب زمانہ پئے آزار ہے تو چپ کیوں ہے
اس سے بہتر ہے کہ تجھ سے کوئی آزار ملے

لذتِ وصل ادھوری ہے بدن تک ہو اگر
وصل تو جب ہے کہ افکار سے افکار ملے

-------O-------

تلخیٔ زندگی کا نام نہ لے
مجھ سے جینے کا انتقام نہ لے

ڈوب ہی جائے کائنات مری
ہاں اگر تیری یاد تھام نہ لے

جس سے کیفِ دوام مل نہ سکے
دستِ ساقی سے ایسا جام نہ لے

دل محبت سے ہو اگر عاری
تو کوئی زندگی کا نام نہ لے

سوزِ پیہم ہے مدعائے حیات

اثر سوز ناتمام نہ لے

غمِ دوراں کی زد میں آ جائے
دل اگر تیرے غم سے کام نہ لے

-------O-------

نہ ہوشیار ہی سمجھے اسے نہ دیوانے
یہ کیوں بنا کئے آبادیوں سے ویرانے

سنا سکے نہ غمِ زندگی کے افسانے
تھے ایک شعلۂ جاں سوز تک ہی پروانے

مری خموشئ پیہم کو کوئی کیا جانے
مرے سکوت میں پنہاں ہیں کتنے افسانے

ہر ایک بت کدہ تھا مرکزِ نگاہ مگر
ترے بغیر نہ راس آئے مجھ کو بت خانے

کمالِ ہوش ہے دیوانگی محبت میں
کمالِ ہوش میں ہیں دوست تیرے دیوانے

میں لے کے آیا ہوں میخانۂ محبت سے
مری نظر میں ہیں رقصاں ہزار پیمانے

سلیم مٹ نہ سکی تلخی غمِ ہستی
علاجِ غم ہی سمجھ کر پیئے تھے پیمانے

-------O-------

کسی کو اپنے دل میں جلوہ آرا کر لیا ہم نے
رواں رگ رگ میں اک برقِ تجلیٰ کر لیا ہم نے

خوشا قسمت کہ جب سے ان کو اپنا کر لیا ہم نے
زمانے کا کوئی غم ہو گوارا کر لیا ہم نے

بہت روکا ہمیں خودداریوں نے پھر بھی کیا کہئے
ترے جلووں کو دیکھا اور سجدہ کر لیا ہم نے

محبت کی یہ مجبوری، یہ لاچاری، ارے توبہ
کہ خود اپنی تباہی کا نظارا کر لیا ہم نے

کسی کی یاد جب آئی سلیم آنسو اُمنڈ آئے
رواں جلتی ہوئی آنکھوں سے دریا کر لیا ہم نے

-------O-------

رکھا نہ کہیں کا ہمیں بے راہ روی نے
مرنے کے سلیقے ہیں نہ جینے کے قرینے

اُف بحرِ محبت کی وہ طغیانئ پیہم
صد شکر کہ ڈوبے نہ محبت کے سفینے

کچھ کوششِ درماں سے ہوئی اور خرابی
کچھ اور بگاڑا ہے غمِ چارہ گری نے

کچھ سعئ مسرت میں ہوئے اور بھی ناکام
کچھ اور دیئے رنج، مسرت طلبی نے

اللہ دے افزونئ وحشت کا وہ عالم
جس سمت نظر کی ہے پکارا ہے کسی نے

ہر گام پہ سو چال ہر اک چال میں الجھن
لوٹا ہے زمانے کو تری راہبری نے

کچھ اور بھی آئے وہ سلیم آج سوا یاد
چھیڑا ہے جو غنچوں کو نسیمِ سحری نے

-------O-------

جب تبسم ترے ہونٹوں پہ بکھر جاتا ہے
سب گلستاں کا گلستاں ہی نکھر جاتا ہے

یہ ترے جور و ستم یاد رہیں گے دل کو
ورنہ جو وقت بھی آتا ہے گزر جاتا ہے

اُف وہ خود دار جو سجدوں سے تو کرتا ہے گریز
تیرے کوچے میں بصد شوق مگر جاتا ہے

زندگانی کا جب آغاز ہے انجام بھی ہے
آدمی کس لئے انجام سے ڈر جاتا ہے

پا سکا ہے نہ تری ایک جھلک بھی اب تک
جو تجھے ڈھونڈنے تا حدِ نظر جاتا ہے

اشکِ غم یہ تو نہیں ہے کہ کبھی تھم نہ سکیں
ان کے آتے ہی یہ طوفان ٹھہر جاتا ہے

ابھی جی بھر کے بھی تجھ کو نہیں دیکھا میں نے
ٹھہر اے دوست، مرے دوست کدھر جاتا ہے

حرم و دیر کا پابند نہیں اپنا دل
تیرے جلوے نظر آتے ہیں جدھر جاتا ہے

لطفِ ہستی وہی دُنیا میں اٹھاتا ہے سلیم

جو خطر گہہ میں بھی بے خوف و خطر جاتا ہے

-------O-------

یاس، وہ دیو جو ہر گل کو مسل جاتا ہے
چمنِ دل کا ہر اک غنچہ کچل جاتا ہے

یہ محبت بھی عجب شے ہے کہ فولاد سا دل
موم کی طرح سے اک پل میں پگھل جاتا ہے

کبھی خود اس سے بھی تسکیں نہیں ملتی دل کو
اور کبھی صرف تصوّر سے بہل جاتا ہے

اس کے بھی جسم پہ ٹکتی نہیں بے تاب نگاہ
سنگ مر سے اگر پاؤں پھسل جاتا ہے

اس کے رخ سے جو پسینے کی برستی ہے پھوار
ایک ایک قطرہ میں مہتاب سا ڈھل جاتا ہے

لاکھ طوفانِ حوادث چلے برہم برہم
ہو اگر عزم اٹل راہ بدل جاتا ہے

استقامت ہے بڑی چیز جہاں میں پیارے
پاؤں کو چوم کے سیل آگے نکل جاتا ہے

-------O-------

وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے
ان کو اس جھوٹ سے کیا جانئے کیا ملتا ہے

سلسلہ گیسوئے پیچاں نے بڑھایا اتنا
کہ ہر اک حلقہ اسی زلف سے جا ملتا ہے

دولتِ وصل جو ہاتھ آئے تو حاصل ہے یہی
کیا وگرنہ صلۂ مہر و وفا ملتا ہے

ہم ہیں غواصِ نگاہ و دل بیدرد مدام
جب بھی ملتا ہے وہ ظاہر میں خفا ملتا ہے

-------O-------

کہاں خلوص ہوس کے خزف میں رہتا ہے
گہر ہے بے غرضی کے صدف میں رہتا ہے

مغنیہ ہی نہ ہو تو کہاں نواریزی
اگرچہ سحر نوا چنگ و دف میں رہتا ہے

متاعِ راحتِ جاں ہے ترا خیال کہ دل
اسی ہی شوق، اسی ہی شغف میں رہتا ہے

وفا سرشتیٔ دل پر ترا ہر اک طعنہ
وہ تیر ہے کہ جو اب تک ہدف میں رہتا ہے

نگاہ خلق سے پنہاں رہیں تو بہتر ہے
یہی سبب ہے کہ گوہر صدف میں رہتا ہے

نہ دار سے ہیں نہ تیر، تفنگ سے خائف
ہم اہلِ صدق ہیں سر اپنا کف میں رہتا ہے

وہ آفتابِ سخن ہیں سلیم ہم کہ قدم
کوئی بھی وقت ہو برجِ شرف میں رہتا ہے

-------O-------

سیاہ خانۂ غم میں یہ کون آیا ہے
دلِ فسردہ کا ہر داغ جگمگایا ہے

بہت سے رنج اٹھا کر یہ بھید پایا ہے
کہ جس کو عیش سمجھتے تھے غم کا سایا ہے

ہزار بار ترے غم میں کھو گئے ہیں ہم
ہزار بار ترے غم سے جی چرایا ہے

غمِ زمانہ کو دی ہے قدم قدم پہ شکست
ہر ایک گام ترے غم نے دل بڑھایا ہے

-------O-------

گو تلخ ہے شراب مگر پھر شراب ہے
واعظ یہی تو تلخیٔ غم کا جواب ہے

پہلے رہا تغافلِ بے انتہا کا غم
اب یہ خلش کہ تیرا کرم بے حساب ہے

تو ساتھ ہے تو غیرتِ فردوس ہے چمن
جنت ترے بغیر اگر ہے سراب ہے

اس کے قدم پہ دولتِ کونین ہے فدا
یہ مت کہو خراب، محبت خراب ہے

ساغر اٹھا کہ پھر غمِ دُنیا غلط کریں
ساقی شتاب کر کہ یہ کارِ ثواب ہے

احساس کیف کیا، میں سراپا سرور ہوں
موجِ نگاہِ ناز وہ موجِ شراب ہے

ہم ہی میں تابِ دردِ محبت نہیں سلیم

پھر کیوں کہیں کہ دردِ محبت عذاب ہے

-------O-------

دیکھ سکتے ہم تو یہ رنگین منظر دیکھتے
حشر تک تیرا جمالِ ناز پرور دیکھتے

پھر جنونِ شوق کا عالم مکرر دیکھتے
پھر تری جانب ذرا سا مسکرا کر دیکھتے

شرم اگر ہوتی عناں گیرِ نگاہ التفات
تو نگاہوں سے نگاہوں کو بچا کر دیکھتے

زندگانی ساتھ دیتی تو پس از جور و جفا
کچھ ترا لطف و کرم بھی بندہ پرور دیکھتے

آنسوؤں سے پاک کر ڈالا ہے سب گرد و غبار
ورنہ اس آئینۂ دل کو مکدر دیکھتے

کچھ مجھی سے ضبط کا دامن نہ چھوٹا ورنہ دوست
اپنی پلکوں پر نجانے کتنے گوہر دیکھتے

کچھ ترے بحرِ کرم کو جوش آ جاتا اگر
اپنے دیوانے کو کیوں یوں خاک بہ سر دیکھتے

ہم اگر روشن نہ کرتے دل کے داغوں کے چراغ
کس طرح سے جادۂ ہستی منور دیکھتے

ہم ہی دنیا کے نظاروں سے نکل آئے سلیم
ورنہ شاید کچھ نہ کچھ دلچسپ منظر دیکھتے

-------O-------

ہم ہی افسردہ فرطِ یاس سے تھے
یا تمہیں کچھ اداس اداس سے تھے

کس قدر ہم سے دور تھے وہ لوگ
جو کبھی دل کے آس پاس سے تھے

کچھ وہی آشنا تھے دنیا سے
جو زمانے میں ناشناس سے تھے

کتنے بیگانۂ وفا تھے سب
گو بظاہر وفا شناس سے تھے

میرا مٹنا تو حادثہ ہی سہی
آپ کیوں اتنے بدحواس سے تھے

--------O-------

رونقِ صد بہار کھو بیٹھے
دولتِ وصلِ یار کھو بیٹھے

آج پھر جانے کتنے لعل و گہر
دیدۂ اشکبار کھو بیٹھے

دامنِ تار تار بھی نہ رہا
دامنِ تار تار کھو بیٹھے

صبر تھا تیری یاد آنے تک
یاد آئی، قرار کھو بیٹھے

بعد مدت ملی مسرت زیست
وہ بھی بے اختیار کھو بیٹھے

یوں خزاں کا سلیم دور چلا
ہم امیدِ بہار کھو بیٹھے

-------O-------

تو ہی پابندِ نگاہِ امتیاز آلُود ہے
ایک ہی ورنہ شہود و شاہد و مشہُود ہے

حد سے باہر کیوں ہوئی جاتی ہے ان کی ہر جفا
کیا ہمارے ضبطِ غم کا امتحاں مقصود ہے

غم نے کس صورت سے دل میں آگ بھڑکائی ہے دوست
آج اپنا ہر نفس اک شعلۂ بے دُود ہے

کوششِ پیہم سے ہی ہوتا ہے انساں کامیاب
کچھ مصائب ہیں مگر پھر منزلِ مقصود ہے

عشق ہی ہے رہنمائے شاہراہِ زندگی
عشق ہی سے روشنئ بزم ہست و بود ہے

قوم کیا ہے عظمتِ افراد کی آئینہ دار
قوم کی بہبود ہی افراد کی بہبود ہے

پہلے تو خود بھی ہو اخلاص و وفا سے آشنا
پھر یہ کہہ دُنیا میں اخلاص و وفا نابود ہے

زندگانی ایک مدت سے ہے وقفِ غم سلیم
راحتِ ہستی کا مجھ تک راستہ مسدود ہے

-------O-------

جب بھی لمحات زرفشاں نہ رہے

مہرباں اپنے، مہرباں نہ رہے

یا بتوں میں وہ بات ہی نہ رہی
دوستو یا ہمیں جواں نہ رہے

آشیاں آشیاں سہی لیکن
کاش یہ فکرِ آشیاں نہ رہے

یا بہار آشنا نہ ہو گل
یا پھر اندیشۂ خزاں نہ رہے

میکدے میں، چمن میں، صحرا میں
غم کے مارے کہاں کہاں نہ رہے

یا تو مٹ جائے یہ جبینِ نیاز
یا ترا سنگِ آستاں نہ رہے

عشرتِ بزمِ دوستاں میں سلیم
حیف اگر یادِ رفتگاں نہ رہے

-------O-------

کبھی حیات کا غم ہے، کبھی ترا غم ہے
عجیب کشمکشِ پے بہ پے کا عالم ہے

تمہیں تجلیٔ رخسار لے کے آ جاؤ !
کہ آج شمعِ مسرت بہت ہی مدھم ہے

ترا خیال ابھی تک ہے مونسِ شبِ غم
کشاکشِ غمِ دوراں میں یہ بھی کیا کم ہے

سراغِ منزلِ مقصود بھی نہیں ملتا،
مگر یہ قافلۂ عمر مائلِ رم ہے

ازل کی صبح بھی ہے اور ابد کی شام بھی ہے
یہ زندگی کہ بہت مختصر، بہت کم ہے

متاعِ ہستیٔ دو روزہ آرزو تیری،
وہ آرزو جو مری زندگی میں مدغم ہے

کچھ اس میں قہرِ زمانہ کا رنگ ہے ورنہ
مزاجِ دوست نہ برہم رہا، نہ برہم ہے

سلیم حسن کی چاہت کسی طرح نہ گئی
اساسِ دردِ محبت بہت ہی محکم ہے

-------O-------

زندگی ربطِ عشرت و غم ہے
خندۂ گل ہے اشکِ شبنم ہے

گاہے ہستی ہے اک حقیقت سی
گاہے ہستی نظر میں مبہم ہے

کیوں نہ سجدہ اسی کے در پہ کریں
جس کا در سجدہ گاہِ عالم ہے

پینے والوں کے سامنے ساقی
کوئی ساغر ہو، ساغرِ جم ہے

جان گھل جائے جس کے فکر میں دوست
ایسی جنت بھی اک جہنم ہے

کیا کہیں اب تو دل کا حال سلیم
ایک بے کیفئ مجسّم ہے

-------O-------

یہ کیسے ہمصفیرانِ چمن ہیں، کیسا گلشن ہے
کہ اپنے دوست تک اپنے نہیں، دشمن تو دشمن ہے

بہار آئی اڑائیں دھجیاں پھر جیب و داماں کی
کسے اب ہوش ہے اتنا کہ یہ جیب اور یہ دامن ہے

تری برق تجلی سے ہے ہلچل بزمِ امکاں میں
کہیں یہ شعلۂ سینا، کہیں یہ برقِ ایمن ہے

دلِ برباد کا کیا حال کہئے، مختصر یہ ہے
کہ دل اب دل نہیں خوں گشتہ امیدوں کا مدفن ہے

نہ جانے حشر کیا ڈھائے خلش دردِ محبت کی
نہ وہ تاب و تواں باقی نہ وہ جاں ہے نہ وہ تن ہے

گلستاں میں نہ پا کر تجھ کو جانے دل پہ کیا گزری
کہ ہم سوچا کئے گلشن کو صحرا ہے کہ گلشن ہے

چمن میں ہر طرف ہے بجلیوں کی کار فرمائی
سلیم اس پر بھی دل میں فکر تعمیرِ نشیمن ہے

-------O-------

قفس میں بادِ صبا گلستاں سے آتی ہے
جہاں لُٹا تھا نشیمن وہاں سے آتی ہے

عجیب شان قیامت نشاں سے آتی ہے

یہ برق کیا کہیں کوئے بتاں سے آتی ہے

ہر اک جفا پہ وفا کا گماں ہوتا ہے
کہ بوئے مہرسی نا مہرباں سے آتی ہے

چمن میں شاخِ نشیمن کی خیر ہو یارب
تڑپ کے برقِ تپاں آسماں سے آتی ہے

یہی جو تلخیٔ شیریں تمہارے غم میں ہے
مرے حبیب یہ لذت کہاں سے آتی ہے

بچھڑ گیا ہے کوئی کاروانِ زیست سے کیا
یہ کیوں صدائے فغاں کارواں سے آتی ہے

سلیم کھل نہ سکا آج تک محبت میں
جفائیں سہنے کی طاقت کہاں سے آتی ہے

-------O-------

اب آ بھی جا کہ مری جاں نکلتی جاتی ہے
حیات اشک کے سانچوں میں ڈھلتی جاتی ہے

ہر ایک کے لئے تیری نظر کا پیام ہے اور
کچھ ایسی طرز سے پہلو بدلتی جاتی ہے

ہوئی ہے یاس سے ہی قطع آرزو لیکن
اسی کی گود میں امید پلتی جاتی ہے

قرار کا ہے یہ عالم کہ بے قراری بھی
ہزار طرح سے کروٹ بدلتی جاتی ہے

چمن سے کیا کوئی شعلہ نوا ہوا رخصت
کہ شاخِ گل کفِ افسوس ملتی جاتی ہے

غموں سے تا بکجا دل کو ہو پریشانی
بہت دنوں سے طبیعت سنبھلتی جاتی ہے

یہ غم کے دن نہ رہیں گے گزر ہی جائیں گے
سلیم، عمرِ زیاں کار ڈھلتی جاتی ہے

-------O-------

کارواں باقی ہے آوازِ جرس باقی ہے
اب بھی منزل کی تمنا میں نفس باقی ہے

رک سکوں گا نہ میں تعمیرِ نشیمن سے کبھی
سارے گلشن میں اگر ایک بھی خس باقی ہے

کیا قیامت ہے کہ سر پھوڑتے جاتے ہیں اسیر
ہمنشیں پھر بھی ہر اک تارِ قفس باقی ہے

جام اٹھانے کی سکت تک نہیں ہاتھوں میں مگر
دل میں ساقی ابھی پینے کی ہوس باقی ہے

اس نے ہونٹوں سے پلائے ہیں بہت جام مگر
وہی جاں بخش حلاوت وہی رس باقی ہے

وجہ صد ننگ ہے یہ فقر و غنا کچھ بھی نہیں
مال و دولت سے اگر کچھ تجھے مس باقی ہے

ختم ہیں عیش کے دن پھر بھی جئے جاتے ہیں
اب کہاں شہد مگر حرصِ مگس باقی ہے

گو کہ مدت سے ہیں آزاد اسیرانِ چمن
آج تک تلخیٔ ایامِ قفس باقی ہے

زندگی موت سے بدتر ہوئی جاتی ہے سلیم
لیکن اب تک وہی جینے کی ہوس باقی ہے

-------O-------

جہاں میں تلخیٔ غم ہی نہیں قرار بھی ہے
چمن میں فصلِ خزاں ہی نہیں بہار بھی ہے

وہ غم کہ جن سے نظامِ حیات ہے برہم
انہی غموں میں ترا رنجِ انتظار بھی ہے

مئے حیات کی تلخی ارے معاذ اللہ
کہ سخت تلخ بھی ہے، سخت خوشگوار بھی ہے

ترا اشارا ہے کچھ اور میری جاں ورنہ
میری صدائے فغاں آسماں فگار بھی ہے

سرُور و کیف کی محفل میں جھُومنے والو !
تمہارے سامنے میدانِ کار زار بھی ہے

سلیم جبرِ محبت بھی جبر ہے لیکن
ہمارے جبر میں کچھ رنگِ اختیار بھی ہے

-------O-------

گو کہ اب حوصلۂ غم نہ توانائی ہے
پھر بھی ہر بات میں اندازِ شکیبائی ہے

یوں نگاہوں کو بچاتے ہوئے جانے والے

کیا یہی عرضِ محبت کی پذیرائی ہے

کیا قیامت ہے ہُوا جس کی محبت میں خراب
مجھ سے ملنے میں اسے بھی غمِ رسوائی ہے

ہے کچھ اس طرح سے وقفِ غمِ ناکامی دل
آج کھائی ہوئی ہر چوٹ ابھر آئی ہے

ایک مدت سے ہے گو ترکِ تعلق تجھ سے
آنکھ بھر آئی ہے جب بھی تری یاد آئی ہے

پھر سلیم آج ہوئے داغِ محبت تازہ
دل کے اجڑے ہوئے گلشن میں بہار آئی ہے

-------O-------

جہاں جہاں غمِ دوراں نے لی ہے انگڑائی
وہاں وہاں ترے انداز ہم کو یاد آئے

خبر نہیں کہ کہاں کاروانِ زیست رکے
نہ جانے کون سی منزل میں دل ٹھہر جائے

خبر نہیں ہمیں کیا آج دل نے ٹھانی ہے
کسی طرح سے بہلتا نہیں ہے بہلائے

سلیم عیش کے لمحے کچھ اس طرح گزرے
چمن سے جیسے گزر جائیں شام کے سائے

-------O-------

وشتِ غربت میں ساتھ ساتھ آئے
دُور تک تیری یاد کے سائے

ماتمِ مرگ، دوستی، افسوس
زندگی نے یہ دن بھی دکھلائے

رچ گئے ہیں فضا میں نکہت و نور
کس کے جلووں نے دام پھیلائے

تم صبا تھے مگر تمہارے لئے
کتنے ہی گل چمن میں مرجھائے

آگ ہی آگ، حیات اپنی
کوئی شبنم نہ ہم پہ برسائے

منزلِ شوق ہو گئی آساں
جب بھی دُشوار مرحلے آئے

ان بگولوں کی تال پر ناچ
جن سے ہستی کا دل بھی تھرّائے

دشمنوں کے بھی دل پہ وار سہے
دوستوں کے فریب بھی کھائے

دل ہے برگِ خزاں رسیدہ سلیم
اب خزاں ٹھہرے یا بہار آئے

-------O-------

پھر کہیں افشائے رازِ دل کا ساماں ہو نہ جائے
نذرِ وحشت پھر کہیں جیب و گریباں ہو نہ جائے

کچھ تمہارے حسن پر تنہا مجھے حیرت نہیں
کون ہے جو تجھ کو دیکھے اور حیراں ہو نہ جائے

حد سے باہر ہوتی جاتی ہے کسی کی ہر جفا
ضبط سے باہر مرا حالِ پریشاں ہو نہ جائے

یہ محبت، یہ جوانی، یہ ترا لطف و کرم
دیکھتے ہی دیکھتے خوابِ پریشاں ہو نہ جائے

شرم سے سمٹی ہوئی سی ترچھی ترچھی سی نگاہ
جس نے دل لوٹا وہی غارت گرِ جاں ہو نہ جائے

بار ہا کرتا ہوں ناکردہ گناہوں کو قبول
ورنہ ڈر ہے وہ جفاؤں پر پشیماں ہو نہ جائے

سوچتا رہتا ہوں غم آسان ہو جائے سلیم
پھر خیال آتا ہے ان کا غم ہے آساں ہو نہ جائے

-------O-------

ہزاروں تاریک راستوں میں قدم قدم پر دیئے جلائے
مگر ابھی تک اسی طرح سے ہیں ظلمتوں کے مہیب سائے

حیات کی وادیوں میں انساں ہے آج بھی ٹھوکروں کی زد میں
دلِ حزیں پر ہزاروں ناکامیوں کی تلخی کے داغ اٹھائے

ہزاروں تارے چمک چمک کر فضا کی وسعت میں کھو چکے ہیں
مگر مقدّر کی تیرگی کے نقوش اب تک نہ مٹنے پائے

حیات اور موت کے معمّوں میں ذہن الجھا ہوا ہے لیکن
حیات کیا ہے، ممات کیا ہے، یہ راز کیسے سمجھ میں آئے

ہزاروں دشوار مرحلوں سے گزر چکے ہیں گزر رہے ہیں

مگر خدا جانے اپنی منزل نگاہ کے سامنے کب آئے

ازل سے موہوم قوتوں سے ہے آج تک آدمی ہراساں
نہ جانے کب تک خود اپنی پوشیدہ عظمتوں کا خیال آئے

میں جس تصور کی شمع رنگیں سلیم دل میں جلا رہا ہوں
یہی تمنا ہے وقت کی آندھیوں کے ہاتھوں نہ بجھنے پائے

-------O-------

عشق میں غم تمام بھول گئے
گردشِ صبح و شام بھول گئے

تیرا طرزِ کلام دیکھ کے ہم
اپنا طرزِ کلام بھول گئے

دل کی سادہ مزاجیاں تسلیم
دام تھا دام، دام بھول گئے

دیکھ کر آسماں کا حشرِ خرام
حسنِ محشر خرام بھول گئے

کتنے ہیں جن کی یاد بھی نہ رہی
کتنے ہیں جن کے نام بھول گئے

اک جہاں تھا زمانہ ساز سلیم
ہم بھی اپنا مقام بھول گئے

-------O-------

رونقِ لالہ زار کیا کہئے
آمدِ نوبہار کیا کہئے

گلستاں موتیوں سے ہے معمور
ہلکی ہلکی پھوار کیا کہئے

غم نے بھی دل کا ساتھ چھوڑ دیا
حالتِ قلبِ زار کیا کہئے

یہ لبِ جُو، یہ چاندنی راتیں
یہ گلوں کا نکھار کیا کہئے

اب ہنسی پردہ دارِ غم نہ رہی
اے دلِ سوگوار کیا کہئے

لاکھ وعدوں کے ٹوٹنے پر بھی
حُسن کا امتیاز کیا کہئے

جبر ہی جبر سہہ رہے ہیں سلیم
تہمتِ اختیار کیا کہئے

نظمیں

آئینہ

۳۰- دیار مغرب میں رات کا منظر

۳۱- دیار مغرب کی ایک رات

۳۲- وطن

۳۳- یادِ رفتگاں

۳۴- نغمۂ صبح

۳۵- ساحل کا نوحہ

۳۶- وہ جن کے نام سے انسانیت شرف پائے

۳۷- ایک امام باڑے کو دیکھ کر

۳۸- خدایان جمہور کا فرمان قوم کے نام

۳۹- نغمۂ خاموش

۴۰- پروانہ اور جگنو

۴۱- کیا کوئی دورِ نو بھی آئے گا

۴۲- تاریکی اور روشنی

۴۳- ایک رات

۴۴- فسوں گر

۴۵- آج ساحل سے آلگی کشتی

۴۶- ایک شبستان میں

۴۷- وادیٔ خواب

۴۸- ایک حسینہ

۴۹- جا کسی اور شہر میں اترا

۵۰- راستہ

۵۱- گوشۂ ذہن

۵۲- اپنے خواب کی تعبیر

۵۳- تحفہ

۵۴- اے عظیم الشان چین

۵۵- انسان

۵۶- ایک فصلِ خزاں

۵۷- امنِ عالم اور محاذِ نو

۵۸- ایک موسمِ سرما

۵۹- حسن کا فرہنگ

۶۰- کشتیٔ امید

۶۱- نور جہاں

-------O-------

باغی

میں نے مے پی ہے میں شرابی ہوں
کون سی مے؟ مئے محبت قوم!
کون سی مے؟ مئے ولائے بشر!
جس سے ہے روشنی قلب و نظر
میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

جس کی اثمار آدمیت سے
لحظہ لحظہ کشید ہوتی ہے
جو پئے آرزوئے شربِ دوام
اور بھی کچھ شدید ہوتی ہے
میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

یہ وہ مے ہے کہ جس کے پینے کو
بندش موقع و مقام نہیں
روح ایثار سے شناسا ہو
اور کوئی شرط خاص و عام نہیں
میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

یہ وہ مے ہے جو میکدوں میں نہیں
نہ خریدار ہی کو ملتی ہے
ابن آدم کے حب میں ہو جو مگن
ایسے سرشار ہی کو ملتی ہے
میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

پست آموزیاں نہیں اس میں
رفعت آموز ہے نشہ اس کا
سرفرازی ہے اس کی خاصیت
ہمت افروز ہے نشہ اس کا

میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

یہ وہ مے ہے کہ جو بھی اس کو پیئے
ابدی طور پر رہے سرشار
اس کا ہوتا نہیں ہے خمیازہ
ٹوٹتا ہی نہیں ہے اس کا خمار
میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

یہ وہ مے ہے نہیں ہے جس کی نظر
زندگی میں نہ ماورائے حیات
اس میں بے شک تمام نشوں کی
مجتمع ہو گئی ہیں ساری صفات
میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

بنت انگور کا جو شیدا ہے
گر اسے چھوڑ کر اسے پی لے
شیر بن کر صفوں پہ باطل کی
لڑکھڑائے بغیر ٹوٹ پڑے
میں نے مے پی ہے، میں شرابی ہوں

ہاں یہی مے ہے میں نے جو پی ہے
محتسب کہہ رہا ہے داغی ہوں
اس کے کہنے سے میں جو رک نہ سکا
نعرہ افگن ہے اب کہ باغی ہوں

-------O-------

کنارِ دریا

آج پھر تنہائی دل کھینچ لائی ہے یہاں
آب دریا کی تموّج خیزیوں کو دیکھنے
جس میں عکس مہرِ تاباں بھی ہے عکس ابر بھی

جس طرح سے روح میں ہے اضطراب و صبر بھی
جس میں پہلی سی ہے جولانی نہ طوفانوں کی خو
جیسے اک مدت سے مدھم سا ہے بحرِ آرزو
دونوں جانب کشت ہیں کشتوں میں شادابی کے دور
جن میں ہے جوش نمو اور رقص سرمستی کے طور
اور پنگھٹ پر سحر افزا حسیناؤں کا زور
مرغ و ماہی خوار و مرغابی و سرخاب اور چپے
کچھ کھڑے، کچھ تیرتے، کچھ جا بہ جا اڑتے ہوئے
جن کو کچھ تاشی شکاری ہیں نشانے پر لئے
کچھ مچھیرے دام پھیلا کر ہیں بے آوازِ لب
جیسے دریا کے جلو ہوں پھیلتے دستِ طلب
ان کو کیا پروا کہ دن ہو ختم اور آ جائے شب
ہر کوئی کوشاں ہے اپنی کامیابی کے لئے
چاہے کوئی کچھ کہے یا چاہے چپ سادھے رہے
خواہ تھم جائے یہ دریا یا روانی سے بہے
دل یہ ماہی خوار و ماہی ہے نہ مرغابی یہاں
کس لئے کرتے ہیں اس پر مشق صیادی یہاں
سینکڑوں تاشی شکاری ساحل دریا کے پاس

-------O-------

دیوانے کی بڑ

آدمی لاکھوں میں جب تھے تو خدا تھے سینکڑوں
سہل تھا ان کے لئے رکھیں بشر کو سرنگوں
اختیاراتِ خدائی بانٹ کر رہتے تھے وہ
آدمی تھے لیکن ان کے واسطے صیدِ زبوں
گلشنِ دوشیزگی کے پھول چنتے تھے بہ جبر
مکر بھی کرتے یہ ربّاؤں سے اور مخلوق سے
ابر کی صورت میں گاؤ نر کی صورت میں کبھی
لے کے اڑ جاتے حسیناؤں کو بِن دیکھے ہوئے
مانگتے تھے بھینٹ دوشیزہ کے تازہ خون کی

کیونکہ لازم تھا بشر سے لیں خدائی کا خراج
عام بھی اور خاص بھی شہزادیاں شہزادے بھی
دیتے تھے نقدِ جوانی کی بھی صورت میں یہ باج
یہ خدا باہم بھی تھے محوِ مصاف و گیر و دار
.... کی طرح رہتے تھے کدورت کوش بھی
گرچہ یہ کچھ رزم آرائی میں رہتے تھے مدام
اور بپا کرتے تھے اپنی بزم ناؤ نوش بھی
یہ تصور خود بشر کا تھا خداؤں کا نہ تھا
کیوں کہ کوئی بھی وجود ان دیوتاؤں کا نہ تھا
پھر خدا گھٹنے لگے یعنی کہ یہ نوعِ بشر
ارتقائے فکر کی منزل کی رہ پیما ہوئی
اور شعورِ کائنات و ذات و اندازِ حیات
بڑھ گیا اور روح میں بالیدگی پیدا ہوئی
ذاتِ واحد کے تصور تک پہنچ کر کوئی دیر
کاروانِ ارتقائے فکر آسودہ ہوا
کچھ یہیں پر رک گئے اور چند آگے بڑھ گئے
کچھ کو احساسِ تلاش وسعی بے ہودہ ہوا
بن گئے پھر ان خداؤں کی جگہ ایسے خدا
جو ہیں انسانوں کی صورت ہی میں انساں کے عدو
جو لہو تک بے کسوں کا چوس لیتے ہیں مگر
کہتے ہیں آؤ کہ ہم رکھتے ہیں رزاقی کی خو
لیکن ان لاکھوں خدایاں زمین کا مکر و ظلم
فاش ہے نوعِ بشر پر اور بشر ہشیار ہے
یہ خدا باہم مقابل ہیں بشر کے ساتھ بھی
اور بشر ان سے مسلسل برسرِ پیکار ہے

-------O-------

شیشۂ صد پارہ

رک گئی وقت کی سانس اور تھمے پیار کے گیت
آ پڑا عشق کے بربط پہ یہ پتھر کیسا

اک چھناکا سا ہوا سرعت رفتار کے ساتھ
سرمدی نغموں کی رو رک گئی جھنکار کے ساتھ
جیسے دل شیشہ صد پارہ کی صورت ٹوٹے
فتح مندی کے ہیں عالم میں کھڑے سنگ انداز
نعرہ افگن ہیں ہر اک سمت کہ دیکھا دیکھا
اے تماشا کے پرستارو بڑھو تو دیکھو
اور تم بھی کوئی پتھر یونہی مارو دیکھو
کل نغمات ملمع کے تھے سب گل بوٹے
ایک ہی ضرب میں اس ساز کے ٹوٹے سب تار
اور خاموش ہوا پیار کا ہر سندیسا
ہم نہ کہتے تھے کوئی جذبہ نہیں ہے جاوید
پیار کے جتنے ترانے ہیں، ہیں سارے جھوٹے

-------O-------

متاعِ درد

نہ جانے کیا ہے مقدر میں اپنے پوشیدہ
قریب قبر ہے یا زیست کا اُجالا ہے
سنبھل رہے ہیں کہ یہ آخری سنبھالا ہے
ابھی تو قافلۂ روز و شب کے پاس وہی
متاعِ درد ہے محرومیوں کی ہے سوغات
اگرچہ موجِ مسرت بھی ہے بروئے حیات
طلوعِ مہر میں بھی رنگ سوگواری ہے
بجھا بجھا سا مہ نیم شب بھی رہتا ہے
خوشی کے ساتھ ہی رنج و تعب بھی رہتا ہے
مہکتی کلیوں کے لب پر پیامِ زیست بھی ہے
مگر چمن میں ہے اب بھی وہ جاں کنی کا سماں
کوئی بتائے یہ فصلِ بہار ہے کہ خزاں
ہزاروں سانپ بھی ہیں مارِ آستیں بھی ہیں
ہر اک قدم ہے پھونکاروں کی دہشت انگیزی
اور اس کے ساتھ کئی ناگنوں کی تن خیزی

اگرچہ کھیل رہا ہوں میں موذیوں سے مگر
نہ جانے کون سے لمحے میں کون ڈس جائے
کہ جس سے جسم اطاقِ لحد میں سو جائے
ہر ایک سمت پر اسرار سائے رینگتے ہیں
کوئی ہے سایہ نمایاں تو کوئی مدھم ہے
یہ صبح و شام یہی روز و شب کا عالم ہے
کہیں کہیں یہ صدا بھی سنائی دیتی ہے
کہ دور جورِ و ستم تو گزر چکا کب کا
جو تیرا درد رہا ہے وہ غم ہے ہم سب کا
مگر میں سوچ رہا ہوں کہ ظالموں کا فریب
کہیں پہن کے نہ آیا ہو ہمدمی کا نقاب
جو توڑ ڈالیں کسی لمحے زندگی کا رباب

-------O-------

جوشِ خرام

بہتے دریا میں وہ موجیں ہیں نہ وہ جوشِ خرام
دشت و گلزار کو کس طرح سے سیراب کرے
بہتا دریا کہ ہے یکساں نہ بلند اور نہ پست
کس طرح سبزہ و گل کو ترو شاداب کرے
جس کے ہیں دونوں کناروں پہ کئی خشک سے پھول
اور سبزہ بھی جسے ہے طلبِ شادابی
جن میں وہ بھی ہیں جو خوشبو و نمی رکھتے ہیں
اور ایسے بھی مہک جن میں نہ ہے خوش تابی
جو تکے جاتے ہیں امواجِ رواں کو پیہم
اسی خواہش سے کہ آغوش کی لذت ہو نصیب
بہتا دریا مگر آہستہ بہے جاتا ہے
چاہے مانوس مناظر ہوں کہ پرہول و عجیب
ریگزاروں کو بھی دھن ہے کہ وہ ان تک پہنچے
جذب جس کا وہ ہر اک قطرۂ بیتاب کریں
فائدہ چاہے کسی کو بھی نہ پہنچے لیکن

ختم اس کا گھر ہستی نایاب کریں
بہتا دریا مگر آہستہ سے ہے محوِ خرام
کوہ کی سمت سے محبوب سمندر کی طرف

-------O-------

طعنۂ احباب

ہے نہ وہ جوشِ جوانی نہ ہے کچھ جاہ و جلال
نہ ہے جاگیر نہ دولت نہ ہی سرمایہ ہے
آسماں چھت ہے، زمیں فرش، جہاں گھر اپنا
جس میں ہر سمت کہیں دھوپ کہیں سایا ہے
قدرداں لاکھوں ہیں غم خوار نہیں ہے کوئی
لاکھوں مدّاح مگر درد سے ہیں بیگانہ
جو تکے جاتے ہیں پڑتے ہیں جو ہم پر پتھر
سنتے ہیں شوق سے کہہ دے جو کوئی دیوانہ
دوستی کا بھی ہزاروں کو ہے دعوے لیکن
ان میں ہر ایک ہے بیگانہ روی کا پیکر
اجنبی جن سے ہیں بہتر یہ ہیں پیارے اپنے
یہ منافق جو محبت کے بنے ہیں مظہر
ہے نہ وہ جوش، نہ وہ ذوق، نہ وہ وضع نہ حال
کس لئے اپنی طرف کوئی حسینا دیکھے
پھر بھی جب لاکھوں حسینائیں تکے جاتی ہیں
دل یہ کہتا ہے کہ ایسے میں کوئی کیا دیکھے
ہاں مگر روح میں یکساں ہے جنوں کا عالم
دیکھنے میں کبھی خوش ہیں کبھی افسردہ ہیں
یہ معمّا تو سمجھ میں نہیں آتا لیکن
چند احباب کا طعنہ ہے کہ ہم مردہ ہیں

-------O-------

ماہیِ تازہ

ایک چھوٹے سے مزین نوش گاہ شہر میں
جس کی آرائش میں ہیں کچھ سادہ پُرکاری کے طور
اور چھت میں مہر چوبی کے ضیا کاری کے طور
اک مسقف حوضِ بلوریں میں ہیں کچھ مچھلیاں
چھوٹی چھوٹی رنگ رنگی سانس لیتی تیرتیں
اور آکسیجن کی نلکی کو یونہی چھوتی ہوئیں
غوطہ زن ہیں بے خیال و بےشعور و بے گماں
جیسے خاک افزا اٹھے بڑھتی ہوئی باد خزاں
مشتری بھی رنگ رنگی ہیں مگر چھوٹے بڑے
غوطہ کھاتے ہیں جو حوض خواہشات دہر میں
شہر سے باہر ہوں یا ہوں اندرون شہر میں
میکدے میں ہوں کہ راہوں میں رہیں سحر رواں
یا یہیں بیٹھے ہوئے باہم کریں خوش گپیاں
جال کانٹے لے کے پھرتے ہیں جو میرے گردوپیش
جب بھی رخ کرتا رہا اس نوش گاہ شہر کا
میری جانب ان کا پیہم حملہ لفظی رہا
ایسے حملے جن میں ان کو ہو گئیں ناکامیاں
کہتے تھے ہو ماہی تازہ ہمارے دام میں
جس کو کچھ کچھ آکسیجن روز و شب ملتی رہے
حوض بلوریں کی چھوٹی مچھلیوں ہی کی طرح سے
اور تجلی کوش صیادوں کی خواہش ہو نہاں
اور خدمت گار و ناظم حاضرین و حاضرات
رکھتے تھے پیش نظر نگراں لوگوں کے نکات
یہ کہ دام مکر و فن میں ان کو لے آئیں یہاں
اور میخانہ ہو، گلشن ہو، ہو گلچیں کو اماں
اب کہ میں نے چھوڑ دی ہے یہ فضا یہ نوش گاہ
کہہ رہے ہیں حملہ آور یہ "بڑی مچھلی" نہ تھا
دام سے نکلا کہ جزو حوضِ بلوری نہ تھا
اس سے ملتا جلتا عالم ہی ہے میں جاؤں جہاں

-------O-------

ایک شام

سرمئی شام طائروں کی اڑان
مضمحل مضمحل نشیمن تک
پر ہے پرواز کی تھکن سے چھک
سرمئی شام، باغ، گھر، میدان
ڈوبتے جا رہے ہیں ظلمت میں
چھپتی جاتی ہے گل کے ساتھ مہک
سرمئی شام، شور، ہنگامے
ہو رہے ہیں کچھ اس طرح تحلیل
جیسے بجھتی ہوئی شفق کی دمک
سرمئی شام، بیچ، خطہ سبز
میں، اداسی، سکوت، تنہائی
شعلہ غم کی جسم و جاں میں دہک
رخ و گیسو کسی کے شعلہ و شام
کر سکیں گے علاج تنہائی ؟
اور وہ بھی طلوع صبح تلک

-------O-------

زندگی اے زندگی

دور نکلا ہے اُفق سے مضمحل افسردہ چاند
چاندنی چھٹکی ہے یوں جیسے ہو یخ بستہ جلن
سرو و شمشاد و صنوبر پابہ گل استادہ ہیں
سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں یاسمین و یاسمن
کانپتے پھولوں کے سائے رینگ کر بڑھتے ہوئے
جیسے رک رک کر چلیں مار سیہ لہرا کے پھن
قلب گیتی پر مسلط ہے خموشی کا طلسم
ذرہ ذرہ ہے سکوت بے کراں میں موجزن
کتنے انساں نیند کے افسوں میں ہیں ڈوبے ہوئے

کتنے انساں خواب کی سرشاریوں میں ہیں مگن
دل ہے اپنا دیدہ بے خواب انجم کا شریک
ہمنوا بے خواب فطرت کی ہے ساری انجمن
نور و ظلمت کلبۂ احزاں میں آویزش میں ہیں
جیسے اک مدت سے ہے اپنی تمنا کا چلن
دھیرے دھیرے چل رہی ہے موجۂ باد شمال
جس طرح رک رک کے ہو بیدار خوابیدہ جلن
صورت سنگ گراں خاموش بوجھل بے صدا
کر رہا ہوں وا دریچوں سے تماشائے چمن
روزنوں سے زرد کرنوں کی برستی ہے جھڑی
جس طرح افسردہ امیدوں کا رقص بے بسی
جاگ اٹھے آج کی شب کتنے یادوں کے جہاں
جن کے رخ پر ایک مدت سے ہے گرد بے کسی
ذہن ماضی کے طرب زاروں میں ہے کھویا ہوا
جب محبت تھی مداوائے غم بے چارگی
جب مری ہستی کا ایواں تھا کسی کا بت کدہ
جس کے طاقوں میں کسی کی موہنی تصویر تھی
جب جہاں آئنہ خانہ تھا کسی کے حسن کا
رقص کرتی تھی ہر اک جانب تجلی کی پری
گردش حالات جب تھی گردش مینا و جام
قہقہے ساغر تھے میخانہ تھی بزم زندگی
جبکہ پتھر بھی برستے تھے تو مثل برگِ گل
اور اب پھولوں میں بھی ہے پتھروں کی برہمی
کھو گیا ہے مرکز جمعیت خاطر کہاں
کو بہ کو لے کر اڑی ہے ہم کو دل کی بیکلی
باد آوارہ کی صورت دل بھٹکتا ہے مدام
اپنی قسمت میں کہاں تھی یہ سدا آوارگی
دن کے ہنگامے مثال دشت دامان طلب
شب غبار راہ کی صورت پیام ماندگی
یہ تفکر، یہ تڑپ، یہ سوز و غم، یہ بے کلی

چین کیسے مل سکے گا زندگی اے زندگی
آرزو اپنی جو تھی ماہ درخشانِ حیات
مضمحل ہے جس طرح سے مضمحل افسردہ ماہ
سرو و شمشاد و صنوبر کی طرح آزاد تھیں
چاہتیں اپنی جو اب ہیں پا بہ گل واندہ راہ
مشکبو تھے عشرتوں کے یاسمین و یاسمن
اب ہیں ان پھولوں کے سائے صورت مار سیاہ
قلب گیتی پر مسلط تھا خروش و جوشِ شوق
اب ہے ہر ذرہ پہ طاری اک سکوت بے پناہ
قہقہوں میں بس رہی تھی موج آہنگ نشاط
اب وہی آہنگ ہیں اک کارواں گم کردہ راہ
تھا ریا پر بھی کبھی حسن صداقت کا گماں
اب صداقت پر بھی ہوتا ہے ریا کا اشتباہ
نیند میں بھی راحتوں کا اک جہاں آباد تھا
اب کہاں خوابی جزیروں کی طلسمی بارگاہ
یہ نظارے بھی تو شب بھر کے لئے دمساز ہیں
خوف و ویرانی سے چاروں سمت تکتی ہے نگاہ
زندگی اک دشت ویراں ہوگئی ہے چار سو
جس کی ویرانی مٹا سکتے نہیں جام وسبو
تجربوں کی سرد ویراں ریگ زاروں کے سبب
دل سمجھتا جا رہا ہے زخم خود ہی ہیں رفو
سوز ہی ہے مدعائے سوزِ بے اندازِ زیست
آئینہ ہی چاہتے ہو آئینے کے روبرو
حسرتیں بن بن کے ناگن جان و دل ڈستی رہیں
آرزو ہی ہو علاج اضطراب آرزو
گردش شام و سحر کا بھی تقاضا ہے یہی
اس کی زد سے کون باہر ہو سکا ہے میں کہ تو
پھر بھی جب نکلے اُفق پر مضمحل افسردہ چاند
چُپکے چُپکے دل سے ہوتی ہے یہی کچھ گفتگو
صورت سنگِ گراں خاموش بوجھل بے صدا

سوچتا ہوں کیا مٹے گی یہ جلن، یہ آرزو

-------O-------

موج صبا

تیرے وصال کی لذت ہے آج تک گُریز
تیرے بدن کی مہک اب بھی کارفرما ہے
وہ تیری زلف معطر کی عنبریں چھاؤں
اب اس کی یاد شب زیست کا اُجالا ہے
میری نگاہ پہ ہیں ثبت اب بھی وہ منظر
وہ تیرے چہرے کی تابش وہ جنبش ابرو
وہ تیری کانپتی آواز کپکپاتے ہونٹ
وہ لمس جس سے ہوئے میرے دل کے داغ رفو
میں زندگی کی المناک تلخیوں سے چور
سکوں کی بھیک ترے در سے لے کے آتا تھا
اگرچہ دل تھا خزاں آشنائے جور و محن
ترے ہی دم سے بہاروں کے گیت گاتا تھا
مجھے یہ وہم و گماں بھی نہ تھا کہ دستِ خزاں
بھری بہار میں بھی پھول توڑ سکتا ہے
خیال و خواب میں بھی میں نے یہ نہ سوچا تھا
ترا وجود مجھے یوں بھی چھوڑ سکتا ہے
مرے قریب ہوئی تو قریب اور قریب
مگر تو موج صبا کی طرح گزر بھی گئی
میں ظلمت شب غم سے گزر چلا تھا مگر
پلک جھپکنے میں وہ لذت سحر بھی گئی
بجا کہ تو بھی بہاروں کی ناز پروردہ
بجا کہ غم نے جہنم کی آگ برسائی
مگر کہاں تجھے ڈھونڈھے کہاں تجھے پائے
تری ادا کا پرستار تیرا شیدائی

-------O-------

الہام سے خرد تک

کتنے انسانوں نے تخیل کے بت خانے میں
کتنے موہوم خداؤں کو کیا ہے تخلیق
اپنے ہی ذہن کی مخلوق کو خالق کہہ کر
بندگی کے لئے کتنے ہی تراشے ہیں طریق
آتش و باد کے آگے بھی رہا سجدہ فگن
ذہن نے اور بھی کتنے ہی بنائے معبود
کتنے ہی راگ رچائے گئے اوتاروں کے
ابدیت کے سنائے گئے کتنے ہی سرود
صاحب وحی اٹھے صاحب پیغام اٹھے
وقت کے ساز پہ گائے گئے الہام کے راگ
خرد و عقل کے خرمن پہ شرارے برسے
علم و دانش کی کتابوں میں لگائی گئی آگ
خانقاہوں میں تقدس کے لبادے اوڑھے
رہزن ہوش بچھاتے رہے تقدیر کے جال
بے نواؤں کو ہوئی صبر و رضا کی تلقین
اہلِ ثروت کے چھپائے گئے سنگیں اعمال
کتنے اُٹھے علم رشد و ہدایت لے کر
آدمیت مگر اس طور بھی گمراہ ہوئی
خیر کے چاہنے والوں نے وہ شر پھیلایا
کہ زمیں اہل غرض کے لئے جنگاہ ہوئی
صاحب سیف اٹھے ظلِ الٰہی بن کر
سامنے آتے رہے اوڑھ کے خدمت کا نقاب
عظمت و ہیبت و شوکت کا بٹھا کر سکہ
محفل عیش میں پیتے رہے جام مئے ناب
یہ معابد، یہ مساجد، یہ کلیسا یہ کنشت
ایسی راہیں ہیں کہ جن کی کوئی منزل ہی نہیں
کتنے فانوس مگر روشنی شمع کہاں
کتنے محمل ہیں مگر لیلیٰ محمل ہی نہیں
یہ توہم کے کرشمے، یہ طلسمی شہکار

ان کے پردے میں ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں
ذہن تاریک میں ابھرے ہوئے تاریک خیال
شعبدہ بازی ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ تقدس کے فسانے، یہ مقدر کے فسوں
انہی حربوں سے حفاظت ہوئی سرکاروں کی
اب کہ تقدیر و تقدس کا فسوں ٹوٹ چکا
ہم کو شاہوں کی ضرورت ہے نہ اوتاروں کی
اب کہ ہے عقل و خرد کا مہ تاباں روشن
ذرے ذرے میں جہاں تاب اجالا ہوگا
اک نئے رنگ سے نکھرے گی عروس گیتی
سحر و ظلمات کا ایواں تہہ و بالا ہو گا
پستیاں جوش بغاوت سے ہوئی ہیں بیتاب
رفعتیں لرزہ بر اندام ہوئی جاتی ہیں
صحن گلشن میں یہ پامال فسردہ کلیاں
اک نئے دور کا پیغام ہوئی جاتی ہیں

فلسفہ کانگرس والوں سے سوال

بزرگ فلسفیو، نکتہ رس خردمندو
تباہ حال بشر کچھ سوال کرتے ہیں
یہ جبروقدر و حدوث و قدم کے ہنگامے
غم جہاں کو بھی کچھ پائمال کرتے ہیں
یہ ذکر وحدت وکثرت، یہ جزو و کل کا بیان
غم بشر کا مداوا نہیں تو کیا حاصل
نکات حادث و ممکن تمام بے معنی
صفات و ذات کی ہر بحث، بحث لاحاصل
بزرگ فلسفیو، عرش سے اُتر آؤ
کہ زندگی کے تقاضے پکارتے ہیں تمہیں
حیات جن کے لئے ہے عذاب مرگ کا نام
اسی حیات کے مارے پکارتے ہیں تمہیں

یہ بعد مرگ کے عقدوں کی سعیٔ حل و کشود
رہِ حیات میں ہے اک مقام گم راہی
عدم کے جادہ و منزل کی جستجو بے سود
جہاد زیست میں لازم ہے زیست آگاہی
نگاہ وسعت افلاک سے اٹھا کے ذرا
زمیں کی سمت بھی غفلت کے خوگرو دیکھو
الجھ رہا ہے بشر آسماں پناہوں سے
جو ساتھ دے نہیں سکتے نظر کرو، دیکھو
فریب خواجگی و سروری اٹھائے ہوئے
تڑپ رہے ہیں اسیر جفائے استحصال
اگرچہ جبر کے قلعوں میں پڑ چکے ہیں شگاف
اگرچہ ہیبت غارت گراں ہے رو بہ زوال
جو ہاتھ آج بلاتے ہیں تم کو اپنی طرف
وہ ہاتھ کل مہ و خورشید و نجم اُچھالیں گے
جلال خواجگی و خسروی سے الجھے ہیں
غرور کج کلہی کو بھی توڑ ڈالیں گے
اتر کے عرش سے اہل زمیں سے مل جاؤ
بڑھو، کہ وقت تمہارے ہی انتظار میں ہے

-------O-------

آدم سے ایٹم تک

وہ گیا وشت زمرد کا فسوں گر راہی
اپنا تاروں بھرا آنچل لئے ظلمات گئی
ذرے ذرے کی طرف بڑھتی ہے تنویر سحر
جس پہ دھوکا سا اجالے کا تھا وہ رات گئی

وہ سر شرق کھلا ہے در دروازۂ صبح
کوہ وصحرا ہو کہ ہو شہر ہے تابندہ زمیں
عرش تا فرش ہے اک تابش زریں کا فسوں
چمک اٹھا ہے رخ شاہد پائندہ زمیں

جانے کب سے یہ مہ و مہر ہیں سرگرم سفر
جانے کب سے یہ تگ و تاز یہ جانکاہی ہے
جانے کب سے ہے یہ گردش یہ ظہور شب و روز
جانے کب سے سفر شام و سحر گاہی ہے

جانے کس کھوج میں ہے قافلہ شام و سحر
اور کس منزل مقصود کی دھن میں ہے رواں
مہر و مہ کون سی بے تاب تمنا کے لئے
بیکراں وقت کے صحراؤں میں ہیں سرگرداں

یوں ہی انسان بھی سرگرم سفر ہے لیکن
دھن ہے منزل گہہ تقدیر جہاں مل جائے
ان گنت سال سے ہے وقف تگ و تاز طلب
تاکہ ہرجبر سے ہر غم سے اماں مل جائے

عمر ہا عمر سے انساں ہے اس جانکاہی میں
کہ زمیں پر کرے اک جنت ارضی تعمیر
اک نیا رنگ، نیا روپ، جہاں کو بخشے
اسی دنیا میں کرے حسنِ سماوی تعمیر

جس کی قسمت میں نہ ہو بادِ خزاں کا تاراج
پھول کلیوں کا اجارا نہ ہو گل چینوں کو
صحن گلشن نہ لٹے اہل غرض کے ہاتھوں
بزم گل میں نہ ملے بار ہوس پیشوں کو

جس میں تاروں کی چمک ہو تو گلوں کی خوشبو
جس میں کوئی غم پستی و بلندی نہ رہے
جس میں راحت ہو، سکوں ہو، طرب افزائی ہو
جس میں کوئی روشِ جاہ پسندی نہ رہے

لیکن اس سعی مسلسل کو ہزیمت بھی ہوئی
لوٹا انساں کو درندہ صفت انسانوں نے
ہر قدم اپنی غلامی کے لئے للکارا
ہیبت و شوکت و طاقت کے پرستاروں نے

جن کے ہاتھوں سے لٹا قافلۂ نوعِ بشر
جن کے ناپاک عزائم نے جہاں کو لوٹا
ہر طرف جن کے عزائم کی چلی بادِ سموم
اور اس قافلۂ سوختہ جاں کو لوٹا

کتنے بہروپ بدل کر وہی رہزن آئے
بار ہا جن سے لٹی دولت تقدیر بشر
جن کے ہاتھوں میں رہی قوت تسخیر جہاں
مشغلہ جن کا رہا کوششِ تسخیر بشر

لیکن اس قافلۂ شام و سحر کے ہمراہ
نور و ظلمات کی اس دست گریبانی میں
ارتقا قافلۂ تیز قدم بن کے بڑھا
نوع انساں نہ رہی بے سر و سامانی میں

بھیڑیے صورت انساں میں لپکتے ہی رہے
پھر بھی آگے ہی بڑھا قافلۂ انسانی
کارواں بڑھ کے رکا، رک کے بڑھا، بڑھ کے رکا
ٹوٹ کر مٹ نہ سکا حوصلۂ انسانی

عمر ہا عمر سے جو خواب حسیں دیکھا ہے
آج انسان اسی خواب کی تکمیل میں ہے
ہر بلندی سے ہر اک جبر سے ہے گرم نبرد
اک نئی زیست نئے دور کی تشکیل میں ہے

اب کہ ہے سامنے منزل گہ تقدیر بشر
نوعِ انساں پہ چلے گا نہ کوئی جبر و فسوں
اب اگر روئے زمیں جنت ارضی نہ بنے
تو دھواں بن کے اڑے ہستی دنیائے زبوں

آسمانوں میں ستاروں میں دہانے بن جائیں
ان دہانوں سے دہکتا ہوا لاوا برسے
مہر و مہ برقِ جہاں سوز زمیں پر اگلیں
زندگی جل — بجھے اور شعلۂ جوالہ بنے

اور اگر قافلۂ شام و سحر کا مقصود
کچھ نہیں ہے تو ذرا دہر توقف فرمائے
ہستیٔ سوختہ ساماں کا نظارا دیکھے
قہقہہ بن کے سماوات کی جانب اڑ جائے

-------O-------

ایک ساکن شہر خموشاں سے

ساکن شہر خموشاں تمہیں معلوم بھی ہے
کوئی بے تاب ہے بے جاں تمہیں معلوم بھی ہے
سنگ سینے پہ دھرے خاک میں روپوش ہو تم
ہم ہوئے چاک بداماں تمہیں معلوم بھی ہے
اتنے روئے ہیں کہ اک قطرہ بھی آنسو نہ رہا
آنکھیں کیسے ہوئیں ویراں تمہیں معلوم بھی ہے
چاندنی رات تمہیں یاد کیا کرتی ہے
ڈھونڈتا ہے مہ تاباں تمہیں معلوم بھی ہے
جگمگا اٹھتے ہیں آنکھوں میں دیئے اول شب
اب بھی ہوتا ہے چراغاں تمہیں معلوم بھی ہے
اب بھی کھلتے ہیں گل و سنبل و نرگس لب جُو
یاد کرتا ہے گلستاں تمہیں معلوم بھی ہے

اب بھی پڑتی ہیں پھواریں چمنستانوں میں
ہوتے ہیں جشن بہاراں تمہیں معلوم بھی ہے
اب بھی چلتی ہے دبے پاؤں صبا گلشن میں
اب بھی کھل اٹھتی ہیں کلیاں تمہیں معلوم بھی ہے
اب بھی اشجار کے سائے لب جو جھومتے ہیں
موجیں ہوتی ہیں غزل خواں تمہیں معلوم بھی ہے
کچھ تو بولو کہ ہجوم غم تنہائی ہے
تم پڑے سوتے ہو گلشن میں بہار آئی ہے

-------O-------

تقدّس کی موت

میں سوچتا ہوں وفور عیش وطرب سے دم گھٹ کے رہ نہ جائے
کہ زندگی کا نگار خانہ ہزار رنگوں سے ہے مزین
حیات کے اس صنم کدے میں ہزاروں روپ اور ہزاروں جلوے
ہر ایک بت رہزن خرد ہے ہر اک صنم آگہی کا دشمن
تجلیاں روح میں اتر کر تبسم برق بن گئی ہیں
نظر نظر دل کی وسعتوں میں سلگ رہی ہے شرار بن کر
ہر ایک جلوہ مری نگاہوں کو خیرہ ساماں بنا رہا ہے
ہر اک مہکتے ہوئے نفس میں فضا معطر، ہوا معنبر
ہر ایک سیمیں بدن کی مستی بھری جوانی پکارتی ہے
مقام سجدہ یہی ہے شاعر، مقام سجدہ یہی ہے شاعر
ہزاروں سحر آفریں کرشمے پیام نظارا دے رہے ہیں
قمار خانے میں جیسے اک اجنبی کو گھیرے ہوئے ہوں شاطر
میں کیا یونہی ایک ایک بت کی طرف لپکتا رہوں جنوں میں
میں کس کو چاہوں میں کس کو چھوڑوں میں کیسے صبر اختیار کر لوں
اگر ہو بس میں تو میں ہر اک بت سے خوب جی بھر کے پیار کرلوں
میں کیوں تقدس کی موت مر کر حیات کو داغدار کرلوں

-------O-------

دوراہے پر

ٹھہر سکو تو ٹھہر جاؤ ورنہ جاؤ بھی
عذاب کشمکش وصل و ہجر تو نہ رہے
جلے تو آتش رخسار سے جلے دامن
وگرنہ ہجر کے شعلوں سے جسم و جان جلے

ترے نظارے کی حدت تری نظر کی تپش
سکون قلب و قرار حیات بن جائے
وگرنہ دور کہیں دور رہ کے یادوں میں
ترا جمال محبت کی آگ برسائے

خود اپنی آتش جاں سوز میں جلے ورنہ
سلگ اٹھے ترے دہکے ہوئے خیال سے دل
کہیں تو جادہ نوردوں کو ہو مقام سکوں
کہیں تو راہ روں کے لئے بنے منزل

جو تم رکو تو مرے خشک کپکپاتے ہونٹ
تمہارے رس بھرے ہونٹوں سے تازگی پائیں
کچھ اور دیر رکیں گردشیں زمانے کی
کچھ اور دیر ہم اک دوسرے میں کھو جائیں

ترے بدن کا مہکتا ہوا حسیں مہتاب
مری تڑپتی ہوئی حسرتوں کو بہلائے
ترے طویل حسیں گیسوؤں کی رنگیں چھاؤں
مرے دہکتے ہوئے جسم و جاں کو سہلائے

چلی بھی جاؤ تو ہر ذرہ، ہر در و دیوار
تری ہی بات تری داستاں سنائے گا
رگوں میں تلخئ احساس زہر گھولے گی

ہجوم درد میں دل ڈوب ڈوب جائے گا

امید و بیم کا لیکن یہ جبر، یہ انداز
عذاب بن کے مری جان کو مسلتا ہے
یہ قہر، یہ خلشِ ناتمام، یہ احساس
مری سسکتی ہوئی روح کو کچلتا ہے

-------O-------

کیا کیا؟

منقلب زیست کے اطوار ہوئے ہیں کیا کیا
پھول بھی چبھتے ہوئے خار ہوئے ہیں کیا کیا

سفلہ پرور ہے زمانے کی ہوا کیا کہیئے
بے شرف حاکم و سردار ہوئے ہیں کیا کیا

دام تزویر لئے مکر و ریا کے بندے
صاحب جبہ و دستار ہوئے ہیں کیا کیا

وہ جو خود اپنی خبر سے بھی رہے بیگانہ
محرم عالم اسرار ہوئے ہیں کیا کیا

اہل باطل تو ہوئے مسندِ حق پر قائم
اہل حق وقف سرِ دار ہوئے ہیں کیا کیا

باخبر لائق تعزیر مگر بے دانش
نقرہ و زر کے طلب گار ہوئے ہیں کیا کیا

کور باطن بھی یہاں بے بصری کے باوصف
مدعی و اولی الابصار ہوئے ہیں کیا کیا

دزد پیشہ تو بنے گنج و خزانہ کے امیں
لٹنے والے ہی خطا کار ہوئے ہیں کیا کیا

اہل تقویٰ تو ہیں گمنام مگر زہد فروش
زہد و تقویٰ کے دکاندار ہوئے ہیں کیا کیا

اے جہاں تو نے نہ کی قدر وفاداروں کی
اہل دل روئے زمیں خوار ہوئے ہیں کیا کیا

سنگ ریزے بھی نہ تھے جن کے مقدر میں سلیم
لعل و گوہر کے سزاوار ہوئے ہیں کیا کیا

-------O-------

لے آئیں گے بازار

حسن اب جنس ہے اور عشق خریدار سلیم
گرمئی حبیب سے ہے گرمئی بازار سلیم

زرگری خلق مجسم کی بنا ٹھہری ہے
زر ہے اب عزت و توقیر کا معیار سلیم

لونڈیاں، بانو و بیگم ہیں بزور دولت
لات و الوات ہیں اب خواجہ و سردار سلیم

کرتے ہیں منصفی و دادگری کے دعوے
وہ جو ہیں نشہ بیداد سے سرشار سلیم

دوستی، الفت و اخلاص، محبت، اخلاق
بیچ دیتے ہیں امارت کے پرستار سلیم

جو کوئی بڑھ کے محبت کی لگا دے قیمت
اس کو رہتی ہی نہیں حسرتِ دیدار سلیم

نقرہ و زر ہے میسر تو میسر ہوں گے
لب و ابرو کمر، کاکل و رخسار سلیم

ہر طرف دام ہوس عام کئے جاتے ہیں
پھر بھی معصوم بنے بیٹھے ہیں زردار سلیم

جن کے اذہان ہیں بے کار، تفکر ناقص
زہر ہے ان کے لئے جدت افکار سلیم

کوئی آواز جو بجلی کی کڑک ہو ورنہ
قوم مردہ ہے سنے گی نہیں زنہار سلیم

غرض کہ دہر تو ہے تنگ شریفوں کے لئے
سفلہ پھرتے ہیں لئے جبّہ و دستار سلیم

عصمتیں ہیں ہوس مال میں اجناس فروش
کھلے بندوں میں ہے ناموس کا بیوپار سلیم

-------O-------

ایک پراسرار حسینہ

اے پر اسرار مہر و مہ زادی
تو ہے کس سرزمیں کی شہزادی
حور ہے یا پری ہے، کیا ہے تو
کن دیاروں کی اپسرا ہے تو
کن طلسمات کی ہے سیارا
سحر و افسوں ہے تیرا نظارا
چشم تخیل کی شرارت ہے

یا فسوں آفریں حقیقت ہے
طبقِ گل ترے حسیں رخسار
تودہَ یاسمیں بدن کے اُبھار
ایک جادو ہے ترا حشر خرام
اک معمّا ہے تیرا حسن کلام
گتھیاں ہیں ترے تبسم میں
چیستاں ہیں ترے ترنم میں
زلف برہم میں نکہتوں کے جہاں
خم ابرو میں آفتوں کے جہاں
کبھی گم اپنی ہی اداؤں میں
کبھی الجھی ہوئی ہے چھاؤں میں
کبھی سرمستیوں کا طوفاں ہے
کبھی اپنے سے بھی گریزاں ہے
کبھی نفرت سے منہ بناتی ہے
کبھی چاہت کے گیت گاتی ہے
یہ محبت کی واردات ہے کیا
یہ طلسم عجائبات ہے کیا
میں کہ ہوں ایک شاعر قلاش
تو گئی تو کہاں کروں گا تلاش
پاس آ، آ کے دور جاتی ہے
کیوں مجھے اس طرح لبھاتی ہے
مجھ میں پہلے ہی تاب درد نہیں
گو مرا رنگ، چہرہ زرد نہیں
اور نزدیک اور نزدیک آ
تو مرے دل کی وسعتوں میں سما
جس کی حد سے کبھی نکل نہ سکے
وصل فرصت کے غم میں ڈھل نہ سکے
حُسن مجبوریوں کا نام نہ ہو
وقت مجبوریوں کا نام نہ ہو

-------O-------

سحر ہونے تک

صدائے پائے ظلمت ہے کہ گونج اٹھی ہے خاموشی
ہوا کی سرسراہٹ ہے کہ سرگوشی ہے روحوں کی
سڑک پر جگمگاتے قمقمے آنکھیں جھپکتے ہیں
کہ لرزش ہے مری ہی نیند سے بھر پور پلکوں کی
ہوا کے دوش پر اک غم زدہ آواز آتی ہے
یہ نغمہ ہے کہ کوئی چیخ ابھری ہے فضاؤں میں
کسی مظلوم کی فریاد ہے یا رقص بسمل ہے
کہ پائل کی چھنا چھن ہے دمکتی رقص گاہوں میں
وہ دور اک قصر رنگیں سے شعائیں چھن کے آتی ہیں
کہ محرومی کی ظلمت میں فروزاں آرزوئیں ہیں
مہکتے جسم ہم آغوش ہیں رقص مسرت میں
کہ مجبوری کے عالم میں تڑپتی جستجوئیں ہیں
کسی رہرو کے پاؤں کی صدا ہے یا ترا غم ہے
جو دل کے گوشۂ تاریک سے آواز دیتا ہے
کوئی چھاگل بجا ہے دور یا دل چونک اٹھا ہے
ترانہ ہے کہ سازِ دل صدائے درد دیتا ہے
طرب انگیز، درد آمیز ، نغمے جب اُبھرتے ہیں
ہوا کے دوش پر آتے ہیں سرگوشی میں کہتے ہیں
ہمارے کیف و کم کا سحر تو ہے رات کا جادو
اجالے تک ہی ظلمت کے طلسمی گیت رہتے ہیں
یہ سحر نغمہ ظلمت کوئی دم میں ہوا ہوگا
صبا کے نرم جھونکوں کو ابھی بیدار ہونا ہے
ابھی تو ذرے ذرے کو ترنم زار ہوتا ہے

-------O-------

دن گیا شام آ گئی

دن گیا، شام آ گئی، بڑھنے لگی افسردگی
ذہن میں غم کے ہزاروں دائرے بنتی ہوئی

دل کہ ہے تیرا تمنائی پرستار جمال
کر رہا. ہے ہر گھڑی ہر موڑ پر تیرا خیال

اور میں ہر اک قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہوا
ہر در و دیوار ہر پتھر سے ٹکراتا ہوا

گردش شام و سحر کے ساتھ ہوں گرم سفر
روح میں پیوست ہیں کتنے ہی خار رہگزر

اک نہ اک منزل کی جانب زندگی بہکی ہوئی
اور کتنے جال کتنے دائرے بنتی ہوئی

نغمگی، شیریں بیانی، دلبری، جادوگری
اور تو ان سحر زا رنگیں جزیروں کی پری

نقرئی جلووں میں جنت کی حسیں رعنائیاں
گفتگو جیسے درِ دل پہ بجیں شہنائیاں

تیرا من بے باک، بے خود، بے نیاز جستجو
ہر قدم تیرے لئے ہے اک جہان رنگ و بو

ہر ادا موج مئے پندار میں ڈوبی ہوئی
ہر اچٹتی سی نظر کھنچتی ہوئی تلوار سی

ساز و چنگ و کیف و کم کے گت پہ ہنستی جھومتی
چل رہی ہے نکہت گل کی طرح مہکی ہوئی

ہر قدم برگ گل تر سے سبک رفتار تر
فرش مخمل کی طرح تیرے لئے ہر رہگزر

زندگی ہر گام پر سرمست ہنستی جھومتی
اور کتنی عشرتوں کے دائرے بنتی ہوئی

کس قدر نزدیکیاں مجبوریاں بر دوش ہیں
ہم بہ آغوشی میں بھی کتنے تہی آغوش ہیں

ہر قدم زنجیر سی بنتی ہوئی مجبوریاں
دائرے ہی دائرے ہیں، دوریاں سی دوریاں

-------O-------

خوابِ زار

یہ بوق و شیپور و طبل و دف کے ابھرتے اور ڈوبتے ترانے
نفیریوں کی بلند آہنگ و دلکش و دلنواز نغمے
طلسم ساماں مغنیوں کے یہ لاجوردیں لباس رنگیں
فضا میں ہر سو بکھیرتے ہیں طرب کے سحر آفریں فسانے
حریر و دیبا و اطلس و کمخواب و زر بفت سے مزیّن
حسیں تکبّر فروش مغرور ماہ پارے رواں رواں ہیں
جہاں جہاں فرشِ مخملیں پر ہجوم ہیں جمع مہ وشوں کے
نزاکتیں ہی نزاکتیں ہیں تجلیاں ہی تجلیاں ہیں
مہین زرکار شامیانوں کی چھاؤں میں زمزموں کی دنیا
چمکتے چہرے، دمکتی نظریں، مہکتی سانسیں، کھنکتی باتیں
فضا میں ہر سمت کتنے ہی جلترنگ بجتے ہیں قہقہوں کے
ہر ایک پیر و جواں ہے سرمست جھومتی ہیں حسیں قناتیں
کہیں ہیں بوڑھے، کہیں ہیں بچے، کہیں چھلکتے ہوئے جواں ہیں
جو رنگ و بو کے جہاں میں گم ہیں، مسرتوں کے مزاج داں ہیں
جو اس زمیں پر حسین قوس قزح کے جلوے لٹا رہے ہیں
مگر ہیں غافل کہ اس جہاں میں عذاب کے بھی کئی جہاں ہیں
یہ جشن ہے آسماں فرازوں کا، سربلندوں کا، داوروں کا
اسی لئے جشن رخصتی، جشن بادشاہی سے کم نہیں ہے

غم جدائی مسرتوں کے، مظاہروں میں دبا ہوا ہے
ہر اک کے ہونٹوں پہ ہے تبسم، کسی کی آنکھوں میں نم نہیں ہے
وہ رسم رخصت ہے آخری مرحلے میں ہلچل مچی فضا میں
ہر ایک جانب عبیر و عنبر ہوئے پر افشاں خنک ہوا میں
ہر ایک کا چہرہ تپتے کندن کی طرح چمکا قدم قدم پر
کھنکتے سکے ہوئے نچھاور بکھر گئیں جنتیں ہوا میں
یہ خواب ہے یا کہ خواب زاروں کا کوئی ٹوٹا ہوا ستارا
جو آسماں کی بلندیوں سے زمیں کے دامن میں گر چکا ہے
یہ سحر آرا، شگفتہ خطہ، مرے وطن ہی کی سر زمین ہے
کہ درد بےچارگی کا احساس خواب عشرت میں ڈھل گیا ہے

-------O-------

بنتِ عم کی عروسی پر

تجھے شباب کا یہ دورِ نو مبارک ہو
نئی فضا، نیا ماحول، تجھ کو راس آئے
نئی نوا ، نئی آوازِ مطرب دوراں
نئی حیات کا ماحول تجھ کو راس آئے

فضا میں رقص کریں کیف کی سبک پریاں
جلو میں لے کے مہکتے ہوئے طرب خانے
قدم قدم پہ ہوں روشن مسرتوں کے چراغ
نفس نفس میں بسیں راحتوں کے کاشانے

نظر میں اب بھی ہے اس جشن کا سماں کہ جہاں
تری حیات نئی منزلوں کی سمت چلی
جہاں سے تجھ کو ملی راحت شریک سفر
جہاں امید نئی وادیوں کی سمت چلی

مری فرسودہ سماعت کی وادیوں میں ابھی
رواں دواں ہیں صداؤں کے دلنشیں دھارے

وہ گفتگو کی چٹکتی ہوئی حسیں کلیاں
وہ قہقہوں کے ترنم فروش فوّارے

وہ دلنواز نفیری ، وہ دلنشیں نغمے
فسوں بکھیرتی آواز بوق و شہنائی
وہ دردناک مسّرت و عشرت غمناک
وہ تابناک فضا میں اداس برنائی

خیال و خواب کے انداز میں ابھرتے ہیں
ہر ایک گام پہ وہ رنگ روپ کے دھارے
نوائے درد کی صورت اداس کرتے ہیں

کہیں خرامِ تجلی، کہیں سکونِ جمال
کہیں چمکتی ہوئی زرنگار سوغاتیں
کہیں ستارہ جبینوں کا مجمع رنگیں
کہیں ہجوم کہیں دُو بہ دُو ملاقاتیں

مرے وجود کے صحرا میں ہیں رواں اب تک
خوشی کے ساتھ وہی دردناک احساسات
یہ بات میرے لئے آتش جہنم تھی
کہ اس فضا میں بھی تھا میری بے بسی کو ثبات

کسے خبر ہے کہ اس جشن ناو نوش میں بھی
مجھے ہجوم میں بھی ڈس رہی تھی تنہائی
ہر ایک کو یہ گلہ تھا، ہر اک کو شکوہ تھا
کہ دور دور رہا تجھ سے کیوں ترا بھائی

ہر ایک خویش شکوہ تونگری کے لئے
نمود ذات کی خاطر جمال آرا تھا
ہر اک عزیز .... کے لئے

تمہارے واسطے تحفوں کے ڈھیر لایا تھا

میں دل شکستہ، تہی دست اور تہی مایہ
ہجوم درد میں کھویا رہا، خموش رہا
مجھے نہ جشن مسرت کا کچھ خیال آیا
نہ کچھ نزاکت ماحول ہی کا ہوش رہا

میں اک خلوص بھرے دل کے ساتھ آیا تھا
مگر مجھے تہی دستی نے شرمسار کیا
مثال برگ خزاں، رنگ و بو کے طوفاں میں
ہر ایک پھول نے شرمندہ بہار کیا

خلوص دولت بیدار ہی سہی پھر بھی
مرا خلوص جواہر میں ڈھل نہ سکتا تھا
یہی خیال مسلسل عذاب تھا......لیکن
کسی طرح، کسی عنواں سے ٹل نہ سکتا تھا

-------O-------

مشکبو زلفیں

تیری مشکبو زلفیں، تیرے ضوفشاں رخسار
تیرے کپکپاتے ہونٹ، تیری لغزش گفتار

تشنگی بڑھاتے ہیں، آگ سی لگاتے ہیں
دل کے ذرّے ذرّے پر، برق سی گراتے ہیں

میں کہ اک مسافر ہوں ، زندگی کے صحرا میں
دل شکستہ و تنہا ، شورش تمنا میں

داغ داغ ہے سینہ ، آبلے ہیں پاؤں میں

چاہتا ہوں دم لے لوں ، پیار کی فضاؤں میں

تیری سمت بڑھتا ہوں ، پاؤں ڈگمگاتے ہیں
روح تھرتھراتی ہے ، ہونٹ کپکپاتے ہیں

اور تو قریب آ کر، لوٹ لوٹ آتی ہے
زندگی کی ویرانی ، پھیل پھیل جاتی ہے

اک فغاں ابھرتی ہے، خامشی کے پیکر میں
تلخیاں اُمنڈتی ہیں، زندگی کے ساغر میں

آس کی فضاؤں میں، آس پھڑپھڑاتی ہے
درد کی خلاؤں میں، زیست ڈگمگاتی ہے

جیسے طائرِ زخمی ، حسرت گلستاں میں
اڑتے اڑتے رہ جائے، بیکراں بیاباں میں

تیری مشکبو زلفیں، تیرے ضوفشاں رخسار
تیرے کپکپاتے ہونٹ، تیری لغزشِ گفتار

تشنگی بڑھاتے ہیں، آگ سی لگاتے ہیں
دل کے ذرے ذرے پر، برق سی گراتے ہیں

-------O-------

دیارِ مغرب میں ایک درویش کی صدا

اے دیارِ طرب و مرکزِ خوبان جہاں
رشکِ باغ عدن و عزتِ فردوس بریں
حُسن ہی حُسن، تجلی ہی تجلی ہے یہاں
تو ہے انگشتریٔ ارض میں تابندہ نگیں
آسمانوں کی بلندی ترے کہساروں میں

ماہ و انجم کی طرح جلوہ فشاں تیری زمیں
وادیاں فرشِ زمرد سے سجی ہیں گویا
اور شہروں کا سماں جیسے ہوں بت خانۂ چیں
نشۂ و کیف و جنوں ہے تیرے گلستانوں میں
جادو و سحر و فسوں تیری بہاروں کے امیں
نکہت و رنگ و ضیا تیری فضاؤں میں رواں
نفس موج صبا، مشک فشاں، عطر آگیں
ذرّہ ذرّہ ہے ترا زمزمہ پردازِ شباب
پھول پھول ایک چمن جانِ سرور وتسکیں
قمقمے جلتے ہیں یوں تیرے شبستانوں میں
مہر و مہ جیسے اُتر آئیں یسار اور یمیں
مرد و زن یوں ہیں ترے جیسے پری زاد و پری
ایک سے ایک ہے بڑھ کر خوش و خوش پوش و حسیں
آبشاروں میں رواں نغمۂ سرمستیٔ شوق
تیرے کہساروں میں ہے سرکشیٔ عرش بریں
تیرے دریاؤں میں رفتار بُتانِ مہوش
مرغزاروں میں مئے حسن زمرد آگیں
دشت و صحرا و بیاباں ہیں ترے رشکِ چمن
اور چمن جیسے خزاؤں سے شناسا ہی نہیں
تیرے اوصاف ہیں اے ارض حسیں اس سے سوا
گو ترا حسن زمانے میں رہا ہے خودبیں
جلوہ و نکہت ورنگ و گل و مل کے باوصف
اختراعات میں لازم ہے تجھے ہو تحسیں
مرکز علم و فن و دانش و عرفاں تو ہے
کعبۂ صنعت ایجاد و کشوف و تکویں
تو ہی ہے مردِ فلاطون و ارسطاطالیس
حکمت و فلسفہ کی جن سے ہے اب بھی تمریں
تری ہی گود میں ایتھنز کی تھی تہذیب پلی
یہیں پروان چڑھی روم کی شان و تزئیں
یہاں سقراط نے وحدت کے جو نغمے گائے

گونجے ہیں کتنے قرن کتنے شہور اور سنین
ہومر و یوسین عکاس نخستین خیال
تیرے یونان میں اُبھرے بصد انداز مہیں
روم میں دانتے نے کی سیر بہشت ارواح
خاکی الاصل کہ تھا ہمدمِ ماہ و پرویں
گائے ملٹن نے یہاں گم شدہ فردوس کے گیت
جن سے گیتی ہے فروزاں وہ سرودِ شیریں
اندلس میں مئے عرفاں کے لنڈھائے گئے خم
تشنہ کاموں کو ملا آب حیات شیریں
شرق نے عرش ہنر پر وہ ستارے چمکائے
جس سے ہر سمت تجلی کی پھواریں برسیں
قرطبہؔ ، فرسیا، اشبیلہ و غرناطہ میں
دانش و فن کی چکا چوند ضیائیں پھیلیں
تیری تاریک گپھاؤں میں اجالا نہ سہی
تیرے ایوانوں کے نظارے ہوئے تو سیمیں
نزہتِ ثانیہ میں جب تیری تجدید ہوئی
علم و دانش کی چلی بادِ خوش فروردیں
ہنر و دانش و عرفاں کے وہ سوتے پھوٹے
اُفق فن سے ابھرتے ہی رہے مہر مبیں
کانٹ و دیکارٹ، سپینوزا و شوپن ہائر
برگساں، بینتھم و مل برکلے اور اس کے قریں
ہیگل و مارکس و اینگلز، میلارمے، نشتے
نطشے، اسٹورٹ، مل اور کتنے ہی دُر ہائے ثمیں
مارکونی و سٹیفن سن و کیوری، نیوٹن
آئن سٹائین اور اس پائے کے سب مخترعین
یہاں ہوگو نے کی تفسیرِ غم نوع بشر
حریت کے لئے روسو نے بنائے آئیں
والٹائر نے بغاوت کے دیئے سوز نہاں
جن کے شعلوں میں جلے کتنے ہی محلوں کے مکیں
حُسن کی قوسِ قزح سے ترے نقاش ابھرے

گاگ اور ریمبراں جیسے سبک دست و مہیں
مائیکل اینجلو جیسا صور آرائے خیال
جس کا ہم پایہ کوئی مانی و بہزاد نہیں
اُبھرے کتنے ہی دل آویز پُر اسرار خطوط
اس پکاسو سے کہ پائندہ ہے تجرید کا دیں
گو ترے شاہوں نے رسوا بھی کیا تھا تجھ کو
تاجروں نے بھی ترے غصب کی مشرق کی زمیں

-------O-------

دیارِ مغرب میں ایک سفر

فرشِ دیبا ہے کہ ہے برف کی چادر ہر سُو
یا کسی دشت میں ہے سورۂ گوہر ہر سو
دشت یخ بستہ بیابان گہر ہے گویا
یا اک الماس کے صحرا میں سحر ہے گویا
دودھیا، بزم مہیں ذرّوں کا پرآب نزول
برق ریزوں کا ہے ٹھٹھرا ہوا پُرتاب نزول
کھیت ہیں پھیلے ہوئے کہر کی جولاں گاہیں
دلِ گیتی سے ابھر آئی ہو جیسے آہیں
جھک کے اُڑتی ہوئی سرمست گھٹاؤں کے ہجوم
ذہن میں جیسے ابھرتی ہوئی یادوں کے ہجوم
پیچ و خم کھاتا ہوا منتظرِ راہِ آہن
جس طرح سے خمِ گیسوئے حسینانِ وطن
اک نہ اک موڑ پہ بل کھا کے لپکتی ہوئی ریل
جیسے صحرا میں رواں تند بگولوں کے سہیل
میرا کیبن ہے کہ اُڑتا ہوا گلزار ہے یہ
یا کوئی تختِ سلمان طرحدار ہے یہ
ہے مرے سامنے اک شوخ و حسیں دوشیزہ
جیسے ہو سحر سے شہکار مصّر زندہ
لب خاموش میں بھی نطق کے چشمے ہیں رواں
اور معصوم نگاہوں میں ہے چاہت کا بیاں

وہی معصوم نگاہی وہی پاکیزہ دلی
جیسے میرے ہی وطن کی کوئی نوخیز کلی
نکہت و رنگ کے سانچے میں ڈھلی ہے گویا
انھیں شاداب بہاروں میں پلی ہے گویا
نکہتیں زلفِ معنبر میں پرافشاں ہیں وہی
رنگتیں روئے دلآویز میں پنہاں ہیں وہی
شرم سے شیشے میں تکتی ہے مرا عکسِ نظر
گم ہے جیسے نہ ہو ماحول کا کچھ ہوش و خبر
کبھی دزدیدہ نگاہوں سے جو تک لیتی ہے
رخ پہ بکھری ہوئی زلفوں کو جھٹک دیتی ہے
جانے ان نظروں میں ہے ذوقِ تجسس کا جنون
یا مسافر کے لئے جذبۂ الفت کا فسوں
میں کہ مشرق کا ہوں اک شاعرِ آوارہ مزاج
چاہتا ہوں کہ دوں اس حسنِ مجسم کو خراج
دلِ گم گشتہ ہے ناواقفِ آداب و رسوم
جانے کیسے ہوں یہاں حسن کے تابندہ نجوم
اپنی بے تابی کا اظہار کروں یا نہ کروں
شوق کو مائلِ گفتار کروں یا نہ کروں
تابکے یونہی تکے جائے گی بے باک نگاہ
اس کی زلف و لب و رخسار کو باحالِ تباہ
اور یہ ریل کہ اڑتی ہی چلی جاتی ہے
سفرِ عمر گریزاں میں ڈھلی جاتی ہے
یہ سفر کچھ سفرِ منزل ہستی بھی نہیں
کوئی دم میں یہ مئے حسنِ پرستی بھی نہیں
پھر بھی اے شوخ حسینہ ترا حسن تاباں
دلِ افسردہ میں اک عمر رہے گا پنہاں
اور ترا نام .... چلو نام کوئی نام سہی
اور میں .... میں بھی تمہارے لئے گمنام سہی
حُسن کا نام نہیں عشق کا بھی نام نہیں
اور سفر بھی ہیں بہت یہ سفر انجام نہیں

-------O-------

پیرس

دُلہن سی راہوں میں رنگین قمقمے ہر سُو
سوادِ شب میں فسوں کار دل نشیں تارے
طلسمِ روشنیٔ سحر پاش ہے کہ یہاں
زمیں سے چاندنی دب دب کے مل رہی ہے گلے
یہ شہر روشنی و ارضِ ماہ و انجم ہے
اسی جہاں میں اسی عرش نیلگوں کے تلے
خنک ہواؤں میں پیغامِ سرکشی ہے یہاں
مئے دو آتشہ ہے عام احتساب نہیں
مسافروں کو خرابات دے رہے ہیں صدا
شراب آبِ مقدس یہاں شراب نہیں
ہجومِ طالب و مطلوب رقص گاہوں میں
کنول ہیں جن کی نگاہوں میں جگمگائے ہوئے
نشاط رقص، خم جسم، گرمیٔ آہنگ
سوادِ شوق میں ہیں آگ سی لگائے ہوئے
یہ ہو لہ لہ کی صدائیں یہ مدمزیل کا شور
یہ مرمریں بدنوں کا خرامِ حشر پیام
شانزالیزے، یہ باغات ، یہ قصور و محل
حیات پر غمِ بے چارگی ہو جیسے حرام
صنم کدوں میں پُر اسرار عیش گاہوں میں
متاعِ حسن و تجلی ہے وقفِ عریانی
سرورِ قربت و لطفِ وصال لالہ رخاں
انہیں نصیب نہیں ہے مقامِ ارزانی
کہاں رکوں کہ نہیں دل کو تابِ نظارہ
کہاں چلوں کہ مرا شوق ہو گیا مفلوج
یہاں بھی جلوہ و جسم و وصال بکتے ہیں
یہاں بھی گنگ ہے تہذیبِ حاضرہ کا عروج
یہاں بھی حسن کی سج دھج فروخت ہوتی ہے

یہاں بھی لوگ جمالِ حیات بیچتے ہیں
وطن میں مشتریٔ حسن و جلوہ ہیں زردار
یہ لوگ حُسن یہاں کس کے ہاتھ بیچتے ہیں
میں اجنبی ہوں، مسافر ہوں، لوٹ جاؤں گا
یہ شہر اگرچہ طلسم و سرود عشرت ہے
دلِ رمیدہ یہاں تھوڑی دیر ستا لے
پھر اس کے بعد وہی دردِ بے مروت ہے

-------O-------

لندن

اس اجنبی فضا میں ہے موجِ مئے سُرور
ہر ایک رہگزر میں ہے سیلابِ رنگ و نور
میخانوں میں شراب ہے رشکِ مئے طہور
ان عشرتوں کی زد میں مگر دل ہے ناصبور
مجھ سے مرے عزیز وطن تو ہے کتنی دور
میرے وطن ، غریب وطن، بے نوا وطن

یہ شاہرائیں اور یہ خیابانِ بے سموم
یہ پیادہ رو جو زیریں زمیں بھی گئے ہیں گھوم
یہ موٹریں، بسیں، یہ دما دم رواں ہجوم
ہر گام جیسے محشرِ خاموش کی ہو دھوم
جیسے ترے خیالوں کے اُمڈے ہوئے نجوم
میرے وطن ، غریب وطن، بے نوا وطن

سنگیں عمارتوں کی قطاریں ضیا فروش
دیوار و بام و کوچہ و بازار حسن کوش
رنگین قمقموں میں حسیں چشمکوں کا جوش
طوفانِ رنگ و نور کی زد میں ہے عقل و ہوش
قدموں کی چاپ میں ترے جھرنوں کا ہے خروش
میرے وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

یہ صنعتوں کی بارگہ عرفاں کی جلوہ گاہ
تشنہ لبان جاں کے لئے چشمۂ پناہ
یہ معرفت کدے سوئے طالب نظر براہ
یہ حورِ فن سے خلوت و جلوت میں رسم و راہ
ٹھہرے کہاں، رکے نہ کہاں، گھومتی نگاہ
میرے وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

یہ ہائیڈ پارک باغ بھی عشرت کا جام بھی
یہ گوشہ گاہِ لطفِ خواص و عوام بھی
یہ قوسِ مرمریں پسِ منظر کا نام بھی
فرحت گہ خواص بھی اور وقفِ عام بھی
وقفِ جنوں بھی مظہرِ سودائے خام بھی
میرے وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

یہ مہوشوں کے جلوے یہ جلووں کی آب و تاب
یہ نو رسیدہ اور یہ چھلکتے ہوئے شباب
یہ جگمگاتے تارے یہ تابندہ آفتاب
یہ حسن بے پنہ کے اُمڈتے ہوئے سحاب
جیسے ترے عروج کے دیکھا کئے ہیں خواب
میرے وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

یہ صبح اور یہ شام یہ شور اور خموشیاں
یہ عیش کی بکھرتی اور اُبھرتی روانیاں
یہ تند گامیاں یہ سبک خوش خرامیاں
یہ کاروبارِ زیست یہ نازک کلامیاں
یہ رنگ اور ترنگ کی بستی ہے تو کہاں
میرے وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

یاں دن میں ہوشیاری فرزانہ ہے حیات

دن ڈھلتے ڈھلتے مستی مستانہ ہے حیات
گیسوئے شام کھلتے ہی میخانہ ہے حیات
اور بزم رقص شب میں پری خانہ ہے حیات
آتی ہے تیری یاد تو افسانہ ہے حیات
میرے وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

ہر گھر محل ہے اور محل قصرِ بے مثال
شفاف آئینے ہیں کہ ہیں راستوں کے جال
ہر چوک ایک شہرِ چراغاں ہے لازوال
ہر منظرِ جمیل ہے آئینۂ جمال
ہے قہر اس سمے ترے افلاس کا خیال
میرے وطن ، غریب وطن، بے نوا وطن

یہ برق پاش صورتیں یہ دلربا شباب
یہ سروقد سمن پر ابھرتے ہوئے شتاب
یہ شوخ پریاں اور یہ پری زاد لاجواب
یہ سن رسیدہ ڈھلتے ہوئے مثلِ آفتاب
دل کو نہیں ہے ایسے سمے میں بھی صبر و تاب
میرے وطن ، غریب وطن، بے نوا وطن

تیرے سپوت تجھ کو سنواریں گے ایک دن
تیرے غموں کا بوجھ اتاریں گے ایک دن
تیری تجلیوں کو نکھاریں گے ایک دن
ذروں سے مہر و ماہ ابھاریں گے ایک دن
دونوں جہاں کے جلووں کو واریں گے ایک دن
میرے وطن ، غریب وطن ، بے نوا وطن

-------O-------

دیارِ مغرب میں رات کا منظر

اونچے مسکن ہیں جیسے کالے دیو

منجمد ہو گئے ہوں افسوں سے
ساحروں کے بسیرے گھرے ہیں
جن سے سیلاب رنگ و نور بہے
قمقموں کی ہیں چشمکیں ہر سو
جیسے تارے اُگے ہوں راہوں میں
روشنی دُھند سے ہے یوں محصور
جیسے دن گھر گیا ہو راتوں میں
پیادہ روؤں پہ رہرووں کا ہجوم
ہے رواں جیسے موجِ طوفاں خیز
جن کا ہر ایک کام ہے گویا
شوقِ رفتار کے لئے مہمیز
صاف و شفّاف شاہراہوں میں
جادہ پیما ہیں آہنیں رہوار
جیسے رنگین وادیوں میں رواں
ہو سبک گام ہاتھیوں کی قطار
مرد و زن لباس و خوش اندام
جیسے پریاں ہوں اور پری زادے
جن کو قدرت برائے مصرفِ خاص
آدمی کا لباس پہنا دے
زیرِ فرش زمیں بھی ہر جانب
راہ کا لسکر ہائے برقی ہے
جس کی پُر پیچ چیستاں ہر سو
ایستگاہوں کے جال بنتی ہے
پھر بھی شاعر کو کرتے ہیں غمگین
اس گلستاں کے چند نظارے
گرچہ آہو مزاج شوخ و حسیں
بھرتے ہیں اس فضا میں طرارے
کارخانوں کے جال ہر جانب
چمنیوں سے دھواں اُگلتے ہیں
یہ مہ وشوں کے حسین جلوے بھی

مال کے قالبوں میں ڈھلتے ہیں
کتنی بے رحم ہیں مشینیں بھی
یہ جبینیں بھی جن کے دام میں ہیں
شام کو جن کا انگ انگ ہے چور
پھر بھی فردا کے انتظام میں ہیں
آدمی کے کلام میں بھی یہاں
برق کی سی ہے تیز رفتاری
فکر و تخیل بھی ہیں برق آثار
کام میں بھی ہے برق آثاری
ہر کوئی شاد کام ہے کہ یہاں
فرصتِ آہ بھی نہیں ملتی
عشرتِ بے پناہ منزل کیا
راحت راہ بھی نہیں ملتی
عشق بھی ہے یہاں حساب و شمار
شوق و جذبہ شمار ہوتا ہے
زندگی سانس سانس گنتی ہے
لمحہ لمحہ شمار ہوتا ہے
آرزوئیں ہیں سنگ و خشت یہاں
آدمی آدمی کا مرقد ہے
جسمِ انساں تو ہے یہاں آزاد
روحِ انساں مگر مقیّد ہے

-------O-------

دیارِ مغرب کی ایک رات

برف ہی برف بچھی جاتی ہے تاحدِ نگاہ
چادرِ یخ میں ہے ملبوس دل افسردہ زمیں
گم ہے سناٹے میں ماحول کی ہر اک آواز
سانس بھی چپ ہے کہ آواز نہ بن جائے کہیں
زمہریری ہیں ہوائیں تو فضائیں خاموش
روح بوجھل ہے گراں باریٔ خاموشی سے

کاش تو ہوتی تو گرماتا فضاؤں کا وجود
حدتِ دید سے یا جوشِ ہم آغوشی سے
میری آہیں، مرے آنسو، مرے شعلے بے سود
تجھ کو بہلا نہ سکے تجھ کو کبھی پا نہ سکے
تپشِ شعلہ سے آہن بھی پگھل جاتا ہے
میرے دہکے ہوئے جذبے تجھے پگھلا نہ سکے
دور ہوں دور، وطن مجھ سے بہت دُور ہے آج
مر بھی جاؤں تو تجھے اس کی خبر ہو کہ نہ ہو
آرزو ہے کہ بہ اندازِ دگر پیار کروں
جا نے راس یہ اندازِ دگر ہو کہ نہ وہ
اجنبی دیس میں رہ رہ کے یہ دل کہتا ہے
زخم خوردہ ہی سہی وقف چمن ہونا ہے
اجنبی دیس سدا رنگ گلستاں ہی سہی
خاک ہونا ہے تو پھر خاک وطن ہونا ہے

-------O-------

وطن

شہرِ غربت میں عزیزانِ وطن یاد آئے
بے وفا ہی سہی یارانِ وطن یاد آئے
اجنبی دیس میں کس شوق سے آئے لیکن
ہر قدم شہر و شبستان وطن یاد آئے
دیکھ کر تندیٔ رفتار میں گم خُوبوں کو
سرو وشمشاد خراماں وطن یاد آئے
تیرہ و تار نم آلود فضاؤں میں یہاں
ماہ و خورشیدِ درخشانِ وطن یاد آئے
زلف کوتاہ لئے جب کوئی مہ رو گذرا
حلقۂ گیسوئے جانانِ وطن یاد آئے
کاغذی پھولوں سے سجتے ہوئے ایوانوں میں
لالہ و سنبل و ریحانِ وطن یاد آئے

دُھند اور کہر میں لپٹے ہوئے گلزاروں میں
سبزہ و سروِ گلستانِ وطن یاد آئے
برق و ماشین کی بھرپور فسوں کاری میں
سبزہ و آب گلستاں وطن یاد آئے
دور صنعت گری و اوجِ ترقی ہیں یہاں
مرحلے کتنے بعنوانِ وطن یاد آئے
خُوب ہے تابشِ رخسارِ بُتانِ افرنگ
پھر بھی ہر گام نگارانِ وطن یاد آئے
جادہ آغوش کشادہ ہی سہی ہر جانب
جادہ و بزم و خیابانِ وطن یاد آئے
ہر گزرگاہ میں رنگین چراغوں کی بہار
دیکھ کر ہم کو چراغانِ وطن یاد آئے
یہ زمیں مرکزِ خوبانِ زمانہ ہے سلیم
پھر بھی ہر گام حسینانِ وطن یاد آئے

-------O-------

یادِ رفتگان

مرا دل رفتگاں کی یاد سے معمور رہتا ہے
وہ جن میں کیسے کیسے گوہرِ نایاب ہستی تھے
شرابِ دوستی سے روح جن کی موج مستی تھی
اسی مے کے نشے سے وہ سراپا کیف و مستی تھے
گلابوں کے حسیں پودے اُگے ہیں جن کی قبروں پر
جو خوشبو دے رہے ہیں خاک کے تودوں میں بھی دب کر

-------O-------

نغمۂ صبح

ظلمتوں سے ڈھکے جنگلوں کی فضا
اب کوئی دم میں کرنوں سے بھر جائے گی
روشنی کے روپہلے سُروں کی ہنسی
راگنی کی طرح سے بکھر جائے گی

بس یہی مختصر وقفہ خوشیوں کا ہے
بس یہی حال عشرت کا، کلیوں کا ہے

-------O-------

ساحل کا نوحہ

یہاں سو و زیاں سب کچھ بھلا کر گم ہوئی بانو
وہ جس کے غرق ہونے پر زبانوں پر فسانے ہیں
یہی بحر، اب سکوں جس کے ہے مد و جزر میں پنہاں
جہاں مرغابیوں کے چار سو اڑتے ترانے ہیں
یہی اک موجِ طوفانی اچانک لے اُڑی اس کو
جو اس کو لے کر اک گردابِ بے پایاں میں جا اتری
بہت سرعت سے گزری زندگی کے مرحلوں سے وہ
کنارے سے اچھل کر جب وہ اس طوفاں میں جا اتری
مسافر جب بھی گزرو تم یہاں سے خیال کر لینا
جو ڈوبی تھی یہاں طغیانیوں میں گِھر کر پل بھر میں

-------O-------

وہ جن کے نام سے انسانیت شرف پائے

جلو میں لے کے پھر آئی ہے گردش ایام
لہو میں ڈوبی ہوئی یاد خونچکان امام علیہ السلام
دلوں میں درد کے سوتے اُبل پڑے ہرسو
ہر اک کے لب پہ ہے روداد شدت آلام
دہانِ زخم کھلے داغ مندمل اُبھرے
کہ ذکر قافلۂ شام کا ہے یہ ہنگام
یہی وہ دن ہے کہ صدق و صفا کے شیدائی
لڑے تھے لشکر باطل سے تادم انجام
یہی وہ دن ہے کہ اہل ستم پہ ٹوٹے ہیں
کڑکتی برق کی صورت سے کچھ بقا انجام
یہی وہ دن ہے کہ سر کٹ گئے مگر نہ جھکے
وہ سر کے جن کو کرے گردشِ فلک بھی سلام

یہی وہ دن ہے کہ ملت پہ کٹنے والوں نے
دیا تھا جبر سے لڑنے کا دائمی پیغام
غضب کا عالم انسانیت سے پیار کیا
جہاں کو اپنا لہو دے کے لالہٗ زار کیا

ازل سے ہے یہی دستور جبر و استبداد
کہ اہلِ حق کے لبوں پر نہ حرف حق آئے
یہی ہے جبر جہاں سوز کی جہانبانی
کہ عظمت بشریت نہ جاگنے پائے
بشر مقام بشر سے نہ ہو سکے آگاہ
کوئی شہی کے در و بام سے نہ ٹکرائے
کبھی نہ ابھرے کہیں راستی کا سر چشمہ
نظام دہر میں جبر و ستم کی بن آئے
بزور لشکر و تیغ و تبر بڑھے باطل
صداقتوں کے لہو میں پھریرے لہرائے
کسی کے لب پہ صداقت کا حرف اگر آئے
تو سر بھی روئے کفِ دست ہی نظر آئے

دلوں پہ رعشہٗ خوف و ہراس طاری ہو
کوئی نہ بچ کے اطاعت کی راہ سے جائے
مگر بڑھا ہے جو حد جفا سے استحصال
تو سامنے کئی مردان حق شعار آئے
بڑھے جو اہل ستم کی طرف عقابانہ
جو بن کے شیر زماں غاصبوں سے ٹکرائے
کبھی کلیم علیہ السلام نے باطل کو پاش پاش کیا
کبھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دو عالم کبھی امام علیہ السلام آئے
اٹھے تو ایسے کہ انسانیت بلند ہوئی
بڑھے تو یوں کہ خدایان وقت تھرائے
اسی جہاد میں آئے وہ فاطمہ علیہا السلام کے لال
وہ جن کے نام سے انسانیت شرف پائے

عجب شکوہ سے مقتل کو اختیار کیا
شہید حق نے عزیزوں کو بھی نثار کیا

ہزاروں روپ میں باطل ابھر کے آتا ہے
کبھی یہ طوق و رسن ہے کبھی یہ مقتل و دار
کبھی ہے محفل جود و سخا میں داد و دہش
کبھی ہے جنگ کے میداں میں تیغ کی جھنکار
ضمیر آدم خاکی کو لوٹنے کے لئے
یزیدیت کا رہا ہے اسی چلن پہ مدار
یہی رہے ہیں فراعینِ وقت کے انداز
یہی رہی ہے یزیدان عہد کی رفتار
کہ آدمی ہو فقط خاک پاک بادشہی
کہ آدمی ہو شہوں کا غلام کارگزار
بشر ہو خاک در بارگاہ سلطانی
چراغ قصر و محل ہوں ثوابت و سیّار
ضمیر ارض و سما میں ہو ظلمتوں کو فروغ
پھرے بھٹکتا ہوا کاروان لیل و نہار
فضا میں صدق و صفا کا علم نہ لہرائے
افق سے مہر حقیقت نہ ہو تجلی بار
نشیب ارض میں بے تاب و زخم خوردہ بشر
فریب خوردۂ فرعونیت رہے برباد
کوئی بھی سرکشی جبر و مہر کر نہ سکے
یزیدیت سے کسی کو نہ ہو سکے انکار
طلوع عظمت انسانیت افق سے نہ ہو
زمیں کے ذرّے نہ بن جائیں آفتاب آثار
مگر یہ ہیبت و جبروت و قہر سلطانی
نہ کر سکی بشریت کو عاجز و لاچار
بڑھی ہے جب بھی ستمگاری یزیدیت
حسینیت نے سنبھالا ہے آدمی کا وقار
بڑھے ہیں برسر میداں وہ مرد حق آگاہ

لے میں ہے قہر کی اداکاری
چہرے پر ہے ملال کا انداز
صدمۂ بے مثال کا انداز
لفظوں میں مد و جزرِ غم کا خیال
چیخنے میں ہے زیر و بم کا خیال
سوز میں ہیں رموزِ موسیقی
ہے صدا راگ پینتروں سے بھری
ہاتھ اُٹھاتا ہے اور گراتا ہے
جیسے انبوہِ غم ہٹاتا ہے
جانے آنسو کہاں سے آتے ہیں
چشمے آنکھوں سے بہتے جاتے ہیں
ماتمی ہیں سیہ لبادے میں
غم فروشی کی شاں پہناوے میں
ہاتھ میں رنگ رنگ کے رومال
تر مگرمچھ کے آنسوؤں سے گال
دائیں بائیں سروں کو موڑتے ہیں
جھوٹے غم کے پھپھولے توڑتے ہیں
ہچکیاں جیسے ساز بجتے ہوں
اشک جیسے چراغ سجتے ہوں
رونے کا ہے مقابلہ جاری
اپنی معراج پر ہے عیاری
دُھن ہے کچھ مفت کا ثواب ملے
حوضِ کوثر کا جامِ ناب ملے
بے عمل عاقبت سنور جائے
روزِ محشر کا غم بکھر جائے
اے ستم پیشہ قوم خوار و لعیں
کربلا کیا ستم کا نام نہیں
اے زبوں ماتمی سیہ کارو
محفلِ قیل و قال کے خوارو
کیا یہی ہے صلہ شہیدوں کا

کہ کرو بزمِ ہاؤ ہو پیدا
ظاہراً رنج و صدمہ جھیلتے ہو
باطناً غم کے کھیل کھیلتے ہو
غصب کرتے ہو حق یتیموں کا
اور گلہ کرتے ہو تم لعینوں کا
کہتے ہو تم شقی تھا ابنِ زیاد
تم کہاں سنتے ہو کوئی فریاد
یوں تو کرتے ہو تم کلام علی علیہ السلام
غم ہے کیوں رہ گیا ہے نام علی علیہ السلام
تم کہ ازم ستم کے ضیغم ہو
کیا جفا پیشگی میں کچھ کم ہو
بے وفا کوفیوں کو کہتے ہو
اور خود شمر بن کے رہتے ہو
تم کو ہے ادعائے دلداری
مشغلہ ہے مگر دل آزاری
گھلتے ہو فکرِ مال و جاہ میں تم
رکھتے ہو کل جہاں نگاہ میں تم
ہے لبوں پر مدام ذکرِ امام
خود یزیدانِ وقت کے ہو غلام
تم میں اب کبھی اگر علی علیہ السلام آئے
پھر وہی زخمِ جاں ستاں کھائے
کیا حسن علیہ السلام اور کیا حسین علیہ السلام و علی علیہ السلام
تم سے ہر اک کی بزمِ زیست جلی
ملتِ بے شرف کے اے زادو
سخنِ اہلِ دل پہ غور کرو
ہاں مگر غور تم کروگے کہاں
تم تو سنتے ہو زُور ہی کی زبان
اپنے اجداد کے حلالی ہو
جو کیا کوفیوں نے تم بھی کرو

-------O-------

خدایانِ جمہور کا فرمان قوم کے نام

مناؤ جشنِ زبوں حالو ! بن چکا دستور
مہیب خطروں کی زد میں تھا رایتِ جمہور
رہی ہماری حکومت تو یہ ضروری ہے
کہ اہلِ ملک میں کوئی نہیں ہے اہلِ شعور
مناؤ جشن کہ طوفانِ حادثات میں آج
تمہارے واسطے کاغذ کی کشتیاں ہیں بہت
عدو کا خوف وطن کی محافظت ہے عبث
کہ ہم ہیں اہلِ حکومت تو مہرباں ہیں بہت
گیا جو دورِ غلامی تو ہم کو سجدہ کرو
کہ آدمی کے مقدّر میں سجدہ ریزی ہے
کرو سلام کہ ہم ہیں خدائے جمہوری
ہمارے دم سے اخوّت کی جلوہ ریزی ہے
مٹا جو عہدِ ملوکیت و شہنشاہی
تو اپنی قوم کے فرماں رواؤں کو مانو
نہ انتخاب ہے لازم نہ مجلسِ شوریٰ
ہمیں کو منتخبِ مجلس و وطن جانو
سوال بھی کوئی گستاخ و بے ادب نہ کرے
کہ بندگی میں توکل کی شرط لازم ہے
عذابِ ذلت و تحقیر ہے تو پھر کیا ہے
یہ کم ہے کیا کہ متاعِ حیات قائم ہے
یہ کیا کہا؟ کہ خطا کچھ نہیں، نہیں، نہ سہی
خطا کی شرط نہیں ہے کسی سزا کے لئے
ذلیل، کیڑو، مکوڑو، جھکو، حضورِ شہی
ہے جس طرح سے روا بندگی خدا کے لئے
زبان کھولو نہ گستاخ و بے ادب لوگو
کہ نظم و نسق تو خیراتِ حکمرانی ہے
بصد نیاز بجا لاؤ شکر ہم وطنو

کہ اپنی قوم میں کس درجہ سخت جانی ہے
پھلو گے پھولو گے دنیا میں تم اسی صورت
کہ اس وطن میں ہمیں حکمراں رہیں دائم
پڑھو ہمارے قصیدے کرو ہمیں تسلیم
وطن رہے نہ رہے ہم کو تم رکھو قائم
نہیں ہے جامۂ تن ؟ تن کی کیا ضرورت ہے
نہیں لوازم ہستی تو زندگی ہے ضرور
نہیں ہے بادہ و ساغر تو کیوں ہو مے خواری
نہیں ہے طاقتِ بادہ کشی تو کیسا سرور
جو سر میں ہے کوئی سودا تو سنگ پر پٹکو
کہ نامرادوں کو حاصل نہ ہو سکے گی مراد
پڑھو قصیدہ ہمارے حضورِ اقدس میں
تمہاری زیست ہو آباد یا رہے برباد
بجا کہ بھوک ہے عام اور غموں کی کثرت ہے
ہر اک کا اپنا ستارہ ہے اپنی قسمت ہے
کہاں چلے ہو مٹانے نوشتۂ تقدیر
جنوں زدو تمہیں زنداں کی ضرورت ہے

-------O-------

نغمۂ خاموش

وہ جس کے نام سے جذبات میں اک تان سی اٹھتی تھی
وہ جس کے نام سے گھونگھرو سے بجتے تھے خیالوں میں
وہ جس کے گرم یاقوتی لبوں میں تھا وہ رس جس سے
حلاوت میری جاں میں تھی حسد تھا خُوش جمالوں میں
وہ جس کا قرب اک طوفانِ سرمستی اٹھاتا تھا
وہ جس کی دید سے رگ رگ میں موج مے سی بہتی تھی
وہ جس کے جسم کا تھا لوچ اک جادو بھرا منظر
وہ جس کی چال شرماتی پون کے مست جھونکوں کو
وہ جس کے روپ میں جنت کے پھولوں کی تھی رنگینی
وہ جس کے رخ سے آتا تھا پسینہ سا گلابوں کو

وہ جس کے لفظ موسیقی کا رس کانوں میں ٹپکاتے
یکایک ہو گئی تھی نغمۂ خاموش کی صورت
وہ جس کے رخ پہ غنچے کھلتے رہتے مسکراہٹ کے
یکایک گم ہوئی ہے صدمۂ خاموش کی صورت
اسے لے کر چلے ہیں ایسی راحت گاہ کی جانب
جہاں اب آفتابِ حشر ہی اس کو اٹھائے گا
جہاں اب صورِ اسرافیل ہی چونکائے گا اس کو
ابد تک اب نہ بولے گی اگر کوئی بلائے گا
وہ اب شانہ بہ شانہ شہرِ خاموشاں کو جاتی ہے
جگاتی تھی جو شانِ حسن سے رفتار کا جادو
اب اس کے سانس کا طائر ابد کی وادیوں میں ہے
وہ جس کی جنبشِ کیف آفریں سے پھیلتی خوشبو
میں ہوں اس کے جنازے میں شریک اک اجنبی بن کر
اعزّہ اس کے سب ماتم خروشانہ روانہ ہیں
مرے دل میں محبت اس کی اک زندہ حقیقت ہے
مگر اوروں کو یہ باتیں بھی اب بھولا فسانہ ہیں
وجود اس کا خوراک گور بن جانے کو ہے لیکن
میں جب تک زندہ ہوں وہ میرے دل میں جلوہ گر ہو گی
اگرچہ زندگی کی کشمکش میں کھو بھی جاؤں گا
مگر اس جیسی صورت دیکھنے میں گم نظر ہو گی

-------O-------

پروانہ اور جگنو

شمع کی انجمن میں اک جگنو
عشق کے سوز سے تہی مایہ
جاں نثاروں کے معرکے سن کر
اک تماشا سمجھ کے در آیا
سُن کے اک پُرسکوت نغمۂ شوق
تک کے اک بے صدا طواف کا رنگ
ہو گیا محوِ کیفِ نغمہ و حسن

جس میں تھا ایک سرمدی آہنگ
کتنے پروانے جزو شعلہ ہوئے
سوز سے سوز ہمکنار ہوا
جس کو تک کر ہر ایک پسماندہ
آگے بڑھنے کو بے قرار ہوا
جذب اور انجذاب کا یہ فسوں
بزم پر دیر تک رہا طاری
قرب جاں سوز میں سمٹ سا گیا
ابدیت کا چشمہ جاری
کتنے پروانے جل بجھے لیکن
آخرش شمع بھی ہوئی خاموش
ان کی راکھ اور اپنے اشکوں میں
ہو گئی اس کی ذات بھی روپوش
ایک پروانہ نے گلستاں سے
جب بھی کی بزم کی طرف پرواز
موج تند ہوا نے پے در پے
کر دیا اس کے راستے کو دراز
آخرش شمع جب ہوئی خاموش
آ گیا بے قرار پروانہ
لیکن اب جلوہ خواب تھا اور حسن
عہد ماضی کا ایک افسانہ
دیکھ کر اس کو بے قرار و خموش
ہو گیا اس پہ طعنہ زن جگنو
کہ ترا عشق ہی نہ تھا صادق
یا نہ تھی جذبہ وفا میں نمو
تو نے کب سوز کا مزہ پایا
تو کہاں اپنی جان پر کھیلا
دور سے تو نے حسن کو دیکھا
شعلۂ قرب کو نہیں جھیلا
سن کے پروانہ نے کہا کہ تجھے

ہے فقط اپنی ہی چمک سے غرض
جیسے بلبل سے گل ہے بے پروا
جس کو ہے اپنی ہی مہک سے غرض
تو کہ عاشق ہے اور نہ شاہد ہے
تو رموز وفا کو کیا جانے
یہی بہتر ہے اس شبستاں میں
تو فقط اپنی ذات پہچانے

-------O-------

کیا کوئی دورِ نو بھی آئے گا

دُور نیلم کے دشت میں اُبھری
کچی چاندی کی ایک خمیدہ لکیر
جیسے ابروئے لیلیٰ شب ہو
جیسے غم کی ہو سیمگوں تنویر
مژدہ سال نو سناتی ہوئی
گیت خاموشیوں کے گاتی ہوئی
تھا یقین اب کے ماہ نو آ کر
عشرتوں کے پیام لائے گا
سال ہا سال کے غموں کا بوجھ
سینۂ زیست سے ہٹائے گا
یہ بھی غم کا پیام لایا ہے
حسرتوں کا سلام لایا ہے
سوچتا تھا کہ دل کے رِستے زخم
کچھ نہ کچھ اب کے مندمل ہوں گے
مٹ کے محرومیوں کے بھاری بوجھ
دور چھاتی سے اب یہ سل ہوں گے
لیکن اب اور بھی بڑھا ہے فشار
جیسے یہ سنگ ہوں گے دل کے پار
اپنی تخفیف، اپنی ناداری
خندہ زن آج بھی نصیب پہ ہے

آج ہمت شکن کچھ اور بھی ہے
زیست جو درد کی صلیب پہ ہے
کیا کوئی درد نو بھی آئے گا
یا کہ دل یوں ہی ڈوب جائے گا
اب جگر چیر چیر جاتے ہیں
لوگ جب قہقہے اُچھالتے ہیں
غمِ تحقیر، صدمۂ تضحیک
اور بھی دل میں گھاؤ ڈالتے ہیں
بے بسی اور بھی کڑھاتی ہے
دیکھ کر مجھ کو مُنہ چڑاتی ہے
ایک بے مایہ خار و خس کی طرح
غم کی آندھی اُڑاتی ہے ہر سو
تلخیاں رچ گئی ہیں رگ رگ میں
زہر میں جیسے بجھ گیا ہو لہو
کوئی منزل نہ کچھ مقام و قیام
اور آندھی کا تیز تر ہے خرام
جس قدر روکتا ہوں بے مصرف
آندھی کچھ اور تیز ہوتی ہے
در بہ در، خانہ خانہ، کُو در کُو
زندگی درد بیز ہوتی ہے
اور قیام و مقام ناپیدا
اس پہ طعنہ کہ تم ہو آوارا
سانس اس طرح کھچ کے آتی ہے
سر بسر ہو کے درد کی فریاد
جیسے اک اک نفس ہو ایسی روح
جو ہوئی ہو صلیب پر آزاد
اس کا کیا مرگ عشق ہی ہے علاج
یا بدل جائے گا جہاں کا مزاج
اپنے مرنے کا بھی نہ ہو گا غم
ہاں مگر برتر از ہمہ مخلوق

کیوں دکھاتی ہے عظمتوں کو مدام
رسن و دار، زہر اور بندوق
وہ جو انساں پہ جیتے مرتے ہیں
کیا وہ کوئی گناہ کرتے ہیں
زیست کے آسماں میں کیا یوں ہی
گھٹتا بڑھتا رہے اُمید کا چاند
اور اشکوں کی ضو فشانی میں
ہو ستاروں کی روشنی بھی ماند
یا اک ایسا بھی دور آئے گا
جو مسرت کے گیت گائے گا

-------O-------

تاریکی اور روشنی

سرمئی محلکوں میں حسن لعل فام اُترا
شعلۂ شفق اُبھرا ارغواں فسوں اُبھرا

جیسے نیل کے بَن میں پھیلتا ہوا سیُندور
یا زمرّدیں صحرا برگ گل سے ہو معمور

شام کے جلو میں پھر بڑھ چلے غمیں سائے
ہر طرف اُمڈتے ہیں عنبریں حزیں سائے

سرمئی ہُوئیں راہیں چھپ گئیں گزر گاہیں
جیسے خواب کے رستے صندلوں سے بھر جائیں

دھیما دھیما سا نغما دل میں جاگ جاگ اُٹھا
ایک مرمریں پیکر دھیان میں سرک آیا

یوں ہی پردۂ شب کو صبح جب ہٹائے گی
ایک آتشیں صورت روشنی دکھائے گی

اے غمیں تمناؤ شام سے نہ گھبراؤ
چھیڑ چھیڑ کر نغمے جان و دل کو گرماؤ

رات ڈھلتی جائے گی اور صبح آئے گی

-------O-------

ایک رات........

خونِ ناحق تھا کیا شفق کا ظہور
جس نے پایا ہے تیرگی کا کفن
چاند بھی مردہ تارے بھی بے جان
روشنی جن کی روشنی کا کفن
چاندنی دل شکستہ و خاموش
سینۂ ارض سے ہے ہم آغوش
ہر طرف ہے مہیب سناٹا
سبزہ و شبنم و چمن خاموش
کتنے ویراں ہیں کس قدر پرہول
در و دیوار و سقف و صحن و بام
جن کے خشت اس قدر ہیں بے رونق
جیسے مُردے جڑے ہوئے ہوں تمام
تیری یادوں کا بھی چمن گم ہے
کوئی رنگت، کوئی مہک، نہ صدا
نہ کوئی باز گشتِ نغمۂ لب
نہ کوئی باز دیدِ لطفِ ادا
دور تک جا بجا غمیں سائے
چاندنی سے ہیں متصل جیسے
دل کے داغوں کی روشنی میں مدام
حسرتوں کے دھویں کے مرغولے
صبح سے شام تک کی بے کیفی
اپنے معراج پر ہے آج کی رات

حد تو یہ ہے ترا تصوّر تک
نغمۂ بے اثر ہے آج کی رات
جتنے نظارے ہیں تصوّر میں
ان کے ایک ایک رنگ میں ہے تھکن
کتنے بے جاں دکھائی دیتے ہیں
تیرے لب، تیری نظریں، تیرا بدن
ذہن میں مرتعش ہیں تیرے نقوش
منتشر جلوہ گاہ بنتے ہیں
جھیل میں جیسے سنگ گرنے سے
کتنے ہی عکسِ ماہ بنتے ہیں
ہائے کیوں ایسی رات پھر آئی
ہائے پھر کیوں ترا خیال آیا

-------O-------

فسوں گر

ڈھلا جو دن تو کئی اک حریفِ محفل مے
پکڑ کے لائے کہیں سے کسی مداری کو
چراغِ بزم کو بجھوا کے نہ تمنا کی
نظر فروز کرے تیرگی کے منظر کو
ذرا سی دیر میں اس نے جگا دیئے وہ طلسم
کہ جس سے دشت بھی کہسار بھی نظر آئے
کبھی تبسمِ گلزار کی دکھائی بہار
کبھی نشاطِ محافل کے رنگ دکھلائے
کئی حریر نما برف سے ڈھکے صحرا
حسین چوٹیاں ڈھلوان شاہراہیں بھی
ہزار رنگ میں اُبھرے ہوئے منارۂ نور
طرح طرح سے سجی لاکھوں عیش گاہیں بھی
پھبن دکھائے چمن میں پھواریں برسائیں
فلک پہ قوسِ قزح کے بھی رنگ دکھلائے

حسین پریوں کی آئی گئی قطاریں بھی
جنھوں نے سحر ترنم کے ڈھنگ دکھلائے
پھر آئے دشت، بگولے، بھنور بھی، دریا بھی
کئی مناظرِ ہیبت میں کائنات ڈھلی
جہاں اندھیروں کے طوفاں رواں ہوئے ہر سو
نگاہِ گمشدگی میں حسین حیات ڈھلی
پھر ایسی شوخ حسینائیں سامنے آئیں
کہ جن کے چہرے درخشندگی کے دھارے تھے
نگاہیں جن کی فروزانیوں کے آئینے
لبوں پہ غنچے چٹکنے کے سے نظارے تھے
مگر یہ سحر جو ٹوٹا تو تھی وہی ظلمت
ہر ایک ذرّے پہ منڈلا رہے تھے اندھیارے
جو پہلے ہی سے تھے بے بس کچھ اور بے بس تھے
کچھ اور غم زدہ تھے دردِ زیست کے مارے
نہ سمجھے زیست کی محرومیاں مٹا دینا
کسی بھی سحر کے منظر کے بس کی بات نہیں
عمل کی ڈھال تمنا کی تیغ کی ہے یہ بزم
جہادِ زیست فسوں گر کے بس کی بات نہیں

-------O-------

آج ساحل سے آلگی کشتی

آج ساحل سے آ لگی کشتی
جس نے دیکھے ہزاروں ہی منجھدار
جس کے کتنے ہی بادباں ٹوٹے
جس کے کتنے ہی بہہ گئے پتوار
پھر بھی جو راستہ بناتی رہی
آج ساحل سے آ لگی کشتی
جو گھری کتنی ہی چٹانوں میں
جس سے کتنے نہنگ ٹکرائے
موت نے جس کی راہ میں ہر سو

کتنے پوشیدہ دام پھیلائے
جو کسی روک سے بھی رک نہ سکی
آج ساحل سے آ لگی کشتی
ظلمتیں جس کی سمت یوں لپکیں
جیسے منہ کھول کر بڑھیں عفریت
جس کو مایوسیوں نے یوں گھیرا
جس طرح ناچتے ہوں بھوت پریت
جو کسی مد میں جزر میں نہ رکی
آج ساحل سے آ لگی کشتی
جس پہ گرجے مدام ابرِ سیہ
جس پہ کتنی ہی بجلیاں برسیں
جس نے کتنے ہی حادثے دیکھے
جس پہ کتنی ہی سختیاں آئیں
جو کسی موجِ تند سے نہ رکی
آج ساحل سے آ لگی کشتی
بڑھ کے ساحل کرے اسے تعظیم
دولتِ امن دے سکوں کا خراج
اس کے بیباک ناخدا کے لئے
نغمۂ عظمت بشر ہے آج
جس سے گونج اٹھے محفل ہستی
آج ساحل سے آ لگی کشتی

-------O-------

ایک شبستان میں

رقص و آہنگ و رنگ و مے و گل بدن
اس شبستان عشرت میں کیا کچھ نہیں
آج کی شب جہاں کس قدر ہے جواں
آج کی رات دنیا ہے کتنی حسیں
ہم کہ ہیں نا شناسائے بزمِ طرب
ہم کو افسوں زدہ دیکھ کر مت ہنسو

باہیں خُوبوں کی باہوں میں ڈالے
رقص کرتے رہو گیت گاتے رہو
تال پر تال دو وجد میں جھوم کر
بزمِ عشرت کی رگ رگ کو گرماؤ تم
لیکن اس رنگ اور چنگ کے سحر میں
ہم پر اپنا تمسخر نہ بکھراؤ تم
ہم کہ جکڑے ہیں زنجیرِ آفات میں
عظمتِ آدمیّت کی خاطر مدام
ہم کو جلوت دکھا کر نہ ترساؤ تم
جو روا ہے تمہیں ہم کو کیوں ہو حرام
پوچھتے ہو ہمیں کونسی قید ہے
جب کہ زنجیر و طوق و سلاسل نہیں
کیا تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے
یہ جو کوئی بھی حق ہم کو حاصل نہیں
ہم کو گھیرے ہوئے ہے اگر سربسر
اہلِ قانون کی مجرمانہ نظر
دل دُکھانا ہمارا تو واجب نہیں
ہم کہ ہیں دردمندانِ نوعِ بشر
ہنستے ہو تم کہ ہم کو اذیت ملے
دل بھر آتا ہے اپنا مگر رحم سے
کیوں تمہاری صدا میں کوئی رس نہیں
قہقہے کیوں لگاتے ہو تم کھوکھلے
بات کہنے کا یہ ایک انداز ہے
ورنہ کب ہم کو حسنِ طلب ہے قبول
جب کرائے کے جلووں سے محفل سجے
شاخِ گل ہو تو بہتر ہے اس سے ببول
جام سے جام ٹکرا کے پیتے تو ہو
تم میں رندوں کا اخلاص بھی تو نہیں
دھن سے دھن، لے سے لے، بھر ملاتے ہو تم
دوستو نغمۂ دل یہی تو نہیں

جو خریدے ہوئے جلوے لاتے ہوں تم
ان سے فرمائش رقص کیا خوب ہے

-------O-------

وادیِ خواب

برگِ گلِ سنبل اور سرو و سمن
ایک دو تین .... اور لاکھوں بھی
سبزہ آغوش وا ہے ہر جانب
چشمِ نرگس کی بھی ہے جادوگری
لیکن اس خوف سے کہ ہر اُمید
ایک آغازِ درد رکھتی ہے
یخ زدہ ہو کے ایک اک امید
دل کے گلشن کو سرد رکھتی ہے
آنکھ تکتی ہے دل دھڑکتا ہے
پھر بھی ہر بار موجِ احساسات
یوں دھندلکوں میں ڈھلتی ہے جیسے
اُفقِ زندگی پہ دن ہو نہ رات
موسمِ گل میں بھی خزاں کی طرح
مجھ کو حاصل ہے صرف گردِ بہار
ایک سنگیں مجسمے کی طرح
جس پہ صدیوں سے پڑ رہا ہو غبار
جب بھی جذبوں کی آنکھ کھلتی ہے
نیند کے سائے پھیل جاتے ہیں
تشنگی کے تقاضے جاگ کے بھی
وادیِ خواب تک ہی آتے ہیں
روح کہتی ہے کیوں سرابِ جمال
اپنی جانب بلا کے ہٹ جائیں
کیوں بڑھے اور عذاب محرومی
کیوں ہم اپنی جگہ سے ہٹ جائیں

-------O-------

ایک حسینہ

کتنی معصوم تھی وہ پیکرِ ناز
کیسا جادو تھا بانکپن اس کا
کتنا تسکین سے تھا ناواقف
دہکا دہکا ہوا بدن اس کا
حسن و معصومیت مجسم تھی

جس کے ساز نفس کی ہر دھن پر
مرتعش ہو کے تار تار بدن
موجِ دریا، موجِ سیل کی طرح
نت دکھاتی تھی بے کلی کا چلن
رقص آمادہ گیسوئے برہم

جس کی زلفوں کے سنبلستان میں
نکہتیں ہر طرف پر افشاں تھیں
جس کے رخسار کے گلستاں میں
رنگتیں سُو بہ سُو فروزاں تھیں
تھی جو خوشبو و رنگ کا سنگم

جس کی مخمور مست آنکھوں میں
ہر قدم حیرتوں کے ڈورے تھے
جس طرح گہری نیلی جھیلوں میں
دلنشیں آتشیں ہلورے سے
جیسے نفرت کے راگ کا سرگم

جو مجھے روز راہ میں ملتی
تو نظر سے نظر ملا کر بھی
اپنے مطلب سے رہتی بیگانہ

دید، دیدار ہی کی حد تک تھی
منزلِ وصل و ہجر تھی مبہم

جو کبھی میرے صحن میں آتی
تو ہر اک ذرّہ جگمگاتا تھا
شاخ گل کی طرح لچکتی جب
سر سے آنچل ڈھلک ڈھلک جاتا
جیسے چھلکا ہو صبح ساغرِ جسم

جب میں سب سے نظر بچا کے اسے
پوچھتا تھا ملو گی خلوت میں ؟
تو وہ آنکھیں جھپکتی جاتی تھی
عرق ہوتی تھی بحرِ حرمت میں
کہتی تھی کیا ہے خلوتی عالم

جیسے ملتی ہوں آپ کو میں یہاں
یوں ہی کیا ہم قریب آئیں گے
آپ کو جیسے دیکھتی ہوں یہاں
کیا یہی لطف دید پائیں گے
لطف دیدار تو نہ ہو گا کم

سن کے یہ ذوق وصل کا عفریت
مجھ سے اس طرح بھاگ جاتا تھا
کہ میں اپنے سوال کے ہاتھوں
آپ ہی آپ جھینپ جاتا تھا
بادو باراں سے جیسے آگ ہو نم

یوں گزرتے رہے کئی مہ و سال
اس کی معصومیت مگر نہ گئی
خلشِ آرزو ابھرتی رہی

جس پر اس کی کبھی نظر نہ گئی
شوقِ گرداب میں تھا پیچ و خم

آخرش اک عجیب بازی گر
جو سیاہی میں تھا مجسم رات
دامِ زر تاب کا دکھا کے فسوں
ہاتھ میں لے کے اس کا نازک ہات
داستاں اپنی کرتا رہا وہ رقم

-------O-------

جا کسی اور شہر میں اِترا

اور وہ انجان پھر بھی گُم سُم تھی
یہ نہ سمجھی یہ کوئی کھیل نہیں
یہ نہ سمجھی کہ یہ ہے وہ سودا
جس کو الفت سے کوئی میل نہیں
بلکہ یہ دشمن محبت ہے

پھر جب آئی تو اس کے چہرے پر
گہری سنجیدگی کے سائے تھے
اس کی گمبیر نیلی آنکھوں نے
کتنے ہی اشک غم بہائے تھے
کتنے تارے تھے جذب دامن میں

بخت نے پھر نئی ہی چال چلی
کر دیا مجھ کو وقفِ در بدری
کھو گیا ایک اک نشاں اس کا
پر تجسس تھی نذرِ بے اثری
جس کا حاصل تھا صرف بے خبری

آج بھی جب کہ کتنے ہی مہ و سال
چمن زندگی میں آئے گئے
مے و ساقی کے کتنے دور چلے
کتنے یہ درد و غم مٹائے گئے
اس کا ہی عکس ہے نگاہوں میں

کیا تصوّر میں آج بھی وہ غزال
ان دنوں کو سمیٹتی ہوگی
اپنی یادیں ابھار کر کچھ دیر
کھوئی کھوئی سی پھر رہی ہوگی
یا بھلادی ہے اس نے ہر اک بات

اب بھی ہے اس کی یاد یوں تازہ
جیسے آ کر ابھی گئی ہو بہار
چمنِ دل کے گوشے گوشے میں
ابھی برسی ہے نرم نرم پھوار
ابھی ٹوٹا ہو رنگتوں کا نکھار

-------O-------

راستہ

چلا ہوں سمتِ نشیمن کہ آدھی رات گئی
تصورات میں ہے عہد رفتہ کی تصویر
کوئی تو رنگ بھروں خواب عیش میں جس سے
ہو خوش گوار سی کچھ حوصلہ شکن تعبیر
اور اپنے ذہن میں کرتا چلوں حسیں تفسیر
طویل راستہ آخر کسی طرح تو کٹے
خیال حال تو کرتا ہے ہر قدم پہ نڈھال
نہ اضطراب فراق اور نہ یاد لطف وصال
کوئی نہیں ہے جسے انتظار ہو میرا

کوئی نہیں ہے کروں جس کو زینت آغوش
طویل عرصہ سے یکساں ہے اپنی اشک و دوش
تھکی ہوئی سی ہیں کرنیں، تھکی ہوئی سی غبار
کہ جیسے درد کا ہر ذرّہ سہہ رہا ہو فشار
درخت جھومتے ہیں پتے سرسراتے ہیں
اور ان کی چھاؤں کا محزوں فسوں ہے یوں جیسے
کسی حسینہ کی پلکوں کے مضطرب سائے
یہ راستہ جو نشیمن کی سمت جاتا ہے
ہے مفلسوں کے دلوں کی طرح اجاڑ بہت
قدم قدم پہ ہے ریت اور سنگ و خار بہت
اب ایسی راہ بجز جبر کس کو ہو مقبول
طبیعت اپنی کروں تو کروں کدھر مبذول
بہت سے کُتوں نے چھیڑے ہیں مغربی گانے
صدا صدا سے ملائے ہوئے ہیں کورس میں
خنک ہواؤں نے بھڑکا جو دی ہے خواہشِ جنس
ہر اک کے ساتھ ہے ایک ایک کتیا مشغول
ہوا کے ساتھ اڑی جا رہی ہے پیہم دھول
اسی ہی شہر میں کتنے ہی راستے ہیں جہاں
بھرے ہوئے ہیں مہکتے سنہرے رقص کدے
صدائے ساز ہم آہنگ گرمیٔ اجسام
قدم قدم سے ہے سینہ سے سینہ وقف کلام
نظر سے بیٹھے ہوؤں کی طرف بھی لطف پیام
ہر ایک پول ہر اک تار ارتعاش میں ہے
صدائیں دوڑ رہی ہیں عجیب ہلچل ہے
زنا، زن اور دنا، دن دنا دنن، دن، دون
جو کر رہے ہیں وصول ان پہ فاش ہے مفہوم
مرے تو دل میں سمائی ہے خواہش مشروم
نہیں ہے قرب کی خواہش سنہرے پتلوں سے
نہ کوئی وجہ حسد ان مہکتے کتوں سے
مگر یہ راہ بہر طور کاٹنی ہے مجھے

کہ اب تو بس یہی انعام زندگی ہے مجھے
جو مجھ میں سنسنیاں ہیں خنک ہوا میں ہیں
دل زمیں میں ہیں، سینۂ فضا ہیں
ہر ایک پھول، میں ہیں اور ہر ایک تار میں ہیں
جھکے ہوئے سے درختوں کے برگ و بار میں ہیں
وہ اک درخت سے لٹکا ہوا سا ہے مہ نو
دل شکستہ نشیمن اسی طرف ہے چلو

-------O-------

گوشۂ ذہن

آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا
لیکن اب اس کی یادوں سے حاصل ہے کیا
جس سے بچھڑے ہوئے مدتیں ہو گئیں
کتنی زرخیز تھی اور حسیں وہ زمیں
کتنے پھول اس زمیں سے اُگے کیا خبر
جانے اب بھی ہے اس میں وہ سحر ادا
یا جوانی کا افسوں بکھر کر رہا
بے وفا تھی جو وہ اس کا اب کیا گلہ
اور نہیں تھی تو بھی اس کا اب کیا صلہ
اور میں بھی کہاں کا وفا دار تھا
آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا
اک کسک سی مگر اب بھی دل میں ہے کیوں
دل خود اپنے ہی ہاتھوں سے کیوں ہے زبوں
اس کلی پر جو چھایا وہ بھنورا سہی
لیکن ان میں جو اب تک ہے وابستگی
دل یہ کہتا ہے دلکش وہ اب بھی تو ہے
اس پہ چھایا ہوا پہلا بھنورا جو ہے
اور شاید محبت ہو ان کی سوا
آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا

ہاں وہ بھنورا کبھی تھا مگر کیا خبر
اب وہ بلبل، یا بھیڑیا بھیڑیا
کچھ بھی ہو مجھ کو اب اس سے حاصل ہے کیا
آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا

-------O-------

اپنے خواب کی تعبیر

بس ایک خواب مگر کتنا ہے بے کران و حسیں
کہ جس کا دیکھنے والا بہک بہک جائے
جو حد ہست ہو کوئی تو ماورا بھی ہو
وگرنہ صرف خیال ایسے اوج تک جائے
کہاں ہیں دودھ سے پانی کی مشکبو نہریں
کہ جس میں تیرتے ہوں طائرانِ طیرانی
کہاں ظروف مرصع ہیں سونے چاندی کے
مئے طہور کرے جس سے نکہت افشانی
جواہرات کے پیڑ اور جواہرات کے تخت
جہاں ہیں دَور میں یاقوت کے صراحیٔ و جام
کہاں ہیں حجرۂ الماس و قصرِ مروارید
جہاں وصال کو حاضر ہیں دائمی اصنام
یہی بہشت ہے، معراج بھی یہی کچھ ہے
کہ ہم زمیں پہ کریں اپنے خواب کی تعبیر
بشر کو کیفِ اخوت سے ہمکنار کریں
یہی خوشی ہو طہوری شراب کی تعبیر
میں آنے والے زمانوں کو دے رہا ہوں صدا
مجھے خود اپنے زمانے سے کچھ نہیں لینا

-------O-------

تحفہ

تم نے چاہا تھا کہ میں دوں تم کو کوئی یادگار
اور میں سوچا کیا، سوچا کیا، سوچا کیا
تم کو کیا دوں؟ تم کو کیا دوں؟ پاس کیا ہے، کیا نہیں
دل سے پوچھا اور دل تڑپا کیا، تڑپا کیا
دُور افق کی سمت اٹھی میری افسردہ نگاہ
اور میں دیکھا کیا، دیکھا کیا، دیکھا کیا
مفلسی، بے چارگی کی سمت تکتی رہ گئی
چاک دل کا ہر رفو اکھڑا کیا، اکھڑا کیا
بے بسی نے درد کے طوفاں اٹھائے روح میں
اک عذاب، اک حشر سا برپا کیا، برپا کیا
کتنے تحفے لعل و گوہر کے تصور نے گنے
میں ہوں کتنا بے نوا سمجھا کیا، سمجھا کیا
میں کہ ہوں اک بے نوا مجبور، بے بس، آدمی
میں کہ میری زندگی ہے رائیگاں میرے لئے
عظمت دل اور خلوص آرزو کے باوجود
کس قدر بے مایہ تھی بزم جہاں میرے لئے
فکر میری گو مہ و انجم کی لاتی ہے خبر
کس قدر بے بس تھی کتنی بے نشاں میرے لئے
بن گئی میرے لئے اک امتحان تیری طلب
داغ دل تھا انتخاب ارمغاں میرے لئے
میں رہا خاموش اور تو بدگماں سی ہو گئی
تو نے سمجھا تیری خواہش ہے گراں میرے لئے
تجھ کو اظہار طلب پر کچھ تاسف سا ہوا
بجھ گئی تو بجھ گئی قندیل جاں میرے لئے
تیرے رخساروں پہ کتنے رنگ آئے اور گئے
رنگتوں کی کس قدر تھیں وادیاں میرے لئے
کچھ حقارت، کچھ محبت، کچھ تمسخر کی ہنسی
تم ہنسیں ہر سمت پھیلیں تلخیاں میرے لئے
میں تھا چپ اور زندگی تھی سر بہ جیب اور مفلسی
سوچتی تھی کوئی عذر ناگہاں میرے لئے

یک بیک مجھ کو خیال آیا کہ میں نے اپنے گیت
تیری خاطر ہی لکھے تھے، ہیں کہاں میرے لئے
میں نے خاموشی سے دے دی اپنی شعروں کی کتاب
روح کی گہرائیوں میں بج اٹھے چنگ و رباب
خوش ہوئی تو میں بھی خوش تھا زیست بھی مسرور تھی
بن گیا زہر اب ہستی موج رنگین شراب
ہو گیا تحلیل میری بے بسی کا رنج و غم
اور عذاب بے نوائی بن گیا موج سراب
یہ بھی اک احساں ترے ذوق ادب پرور کا تھا
ورنہ ملتے ہیں کہاں لعل و زمرد خواب میں
دل کے صدمے تابکے ڈھلتے رہیں گے نظم میں
رک بھی جا اب اے قلم اب تھم بھی اے چشمِ پُرآب

-------O-------

اے عظیم الشّان چین

اے کہ جنگ حق میں سب کو حوصلہ دیتا ہے تو
اے کہ دنیا بھر کے درماندوں کا دکھ سمجھا ہے تو
ظالموں کے حق میں دہشت، خوف اور دھڑکا ہے تو
اے کہ ظلمت کے لئے برق فنا افزا ہے تو
ارتقا کا ہر قدم تیری بدولت سہل ہے
جو بشر پر بند تھی راہِ اخوت سہل ہے

اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشّان چین

اے کہ تو نے سامراجی تاجروں کو مات دی
اے کہ تو نے خونی استحصالیوں کو مات دی
دیوِ استعمار کی خونخواریوں کو مات دی
اے کہ تو نے موت کے بیوپاریوں کو مات دی
مشعلِ فکر و عمل روشن ہے تیرے نام سے
سام پر طاری ہے لرزہ تیرے ہر اقدام سے

اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

تیرے کمیونوں میں حسنِ زندگی کا راج ہے
محنت اور عز و وقارِ آدمی کا راج ہے
امن، آزادی، اخوت، سرخوشی کا راج ہے
حرّیت کی رہبری ہے، روشنی کا راج ہے
سامراجی طاقتوں کو موت کا پیغام ہے
رام راجی زرپرستوں کو فنا کا دام ہے

اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

کھل اُٹھے تیری بدولت آرزوؤں کے کنول
ڈھل گئے ہیں باغ و گلشن میں تیرے صحرا و تل
فوجِ آزادی کے بادل چھا گئے ہیں دل کے دل
ظلمت مغرب پہ ہے یلغارِ مشرق بے مثل
پیش قدمی سن اٹھاون سے ہے جس تحریک کی
عصر حاضر میں اسی سے ہے نجات آدمی

اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

تیرے بیٹے آج سب یک قالب و یک جان ہیں
وحدت منزل کی دُھن میں سب کے سب یکساں ہیں
ایشیا کی آن ہیں، انسانیت کی جان ہیں
عالمی محنت کشوں کی آبرو ہیں، شان ہیں
عزم، ارادہ، حوصلہ، محنت کشوں میں تجھ سے ہے
افتخار و سربلندی سروروں میں تجھ سے ہے

اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

ویت نام اور ارضِ کشمیر، آج ہیں میدان جنگ
جن میں ہے تو سامراجی رقص با سامانِ جنگ
تنگ ہے اُن پر مگر فرشِ زمیں، دامان جنگ
دھیرے دھیرے مٹ رہے ہیں سلسلہ جنبانِ جنگ

تجھ سے حریت پرستوں کے ہیں قائم حوصلے
تو کہ نو آبادیاتی طاقتوں کی موت ہے
اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

ایشیا کا تُو ہے فرزندِ عظیم و سربلند
میرا پاکستان بھی ہے با وقار و ارجمند
ہے مصافِ حق میں اپنا اتحاد سودمند
گردنِ ظالم میں حق خود ارادی کی کمند
حملہ آور بھیڑئے ہیں جس سے بوکھلائے ہوئے
اور عوامی فتح کے پرچم ہیں لہرائے ہوئے
اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

ایشیا کی سرزمیں پر ہے جو ڈالر سامراج
وہ جنوبی کوریا اور سیام پرور سامراج
دوزخ و تحت الثریٰ سے ہے جو بدتر سامراج
اس نے پالا ہے اشوکا کا جو چکر سامراج
ویت نام اور ارضِ کشمیر، اُن کی جولاں گاہ ہے
جو عدم تک ان کو لے جائے یہ اُن کی راہ ہے
اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

سامراجی، سازشی، ہر سو ذلیل و خوار ہیں
ایشیا کے باخبر جمہور اب بیدار ہیں
تیری عظمت، تیری رفعت، کے علم بردار ہیں
سام سے جو ویت نامی بر سرِ پیکار ہیں
فتح و نصرت ہر طرف آغوش وا اُن کے لئے
تیری جانب دیکھتی ہے جا بجا اُن کے لئے
اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

ہو وہ امریکی، فرانسیسی، کہ انگلیسی نژاد
یا وہ بھارت کا جنون عصبیت اوطاں بلاد

سامراجی نظمِ نو ہو یا ہو وہ کہنہ نہاد
توڑ دیں گے مثلِ تارِ عنکبوت انسان زاد
اب نہ انسانی لہو کے جام اچھالے جائیں گے
اب نہ ظالم موت کے چکر سے باہر آئیں گے
اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

عصرِ حاضر ہے یہ دَور اک انقلابِ نو کا ہے
اور تقاضا سوئے منزل اک شبابِ نو کا ہے
غلغلہ سارے جہاں میں آفتابِ نو کا ہے
ہاں یہ وقت انسانیت کی آب و تابِ نو کا ہے
سرخیٔ خونِ شہیداں سے جِلا پائے ہوئے
کتنی دلکش صبح ہے رنگِ بقا پائے ہوئے
اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

ٹوٹتا جاتا ہے حلقہ ظلم کی زنجیر کا
ہاں یہی معنیٰ ہے اب انسان کی تقدیر کا
حریّت ہے ایک رخ اس عظمتِ تنویر کا
دوسرا رخ ہے مساوات اس نئی تصویر کا
اس کا مظہر چین و پاکستان ہے وت نام ہے
ظالموں کے روزِ ہستی کے لئے اب شام ہے
اے جیالوں کی زمین
اے عظیم الشان چین

-------O-------

انسان

بیکراں بیکراں جاوداں جاوداں
جلوۂ ہست و بود آسماں آسماں
کیمیائے حیات ایک جادو گری
جس کا ساحر ہے خود جزوِ صورت گری
انقلابوں کی امواج ابھرتی ہوئی

موج در موج ہستی سنورتی ہوئی
بزمِ فطرت میں ہے ایک سی بود و باش
میری محرومیاں نقصِ نظمِ معاش
رنج و حرماں خود انساں نے پیدا کئے
کیوں چلے آدمی خود کو تنہا کئے
میں بھی تنہا ہوا تو بڑھے یہ حصار
جیسے سینے پہ چڑھ جائیں گے کوہسار
توڑ ڈالیں مگر میں نے حد بندیاں
ذرّہ ذرّہ بنا پھر مرا رازداں
چاند تاروں سے میری محبت بڑھی
سبزہ و گل سے میری رفاقت بڑھی
رقص کرتی ہوا وجد کرتے شجر
مسکراتی شفق مہکی مہکی سحر
پتے پتے کے رقصِ طرب میں رہا
جاوداں عشرتِ بے طلب میں رہا
نغمۂ سیر سیارگاں کے سُنے
کتنے خاموش بول آسماں کے سُنے
زہرہ و مشتری و زحل میں رہا
چاند کی چاندنی کے محل میں رہا
روز و شب کے تغیّر کی کیف آوری
بیکراں ذات کا حسنِ جادوگری
موسم آتے رہے اور جاتے رہے
نت نئے رنگِ ہستی دکھاتے رہے
غم ڈبوئے بہت بحر زخار میں
جال توڑے بہت زورِ رفتار میں
زندگی رقص ہے، وجد ہے، گیت ہے
جس نے سمجھا اسی کی یہاں جیت ہے

-------O-------

ایک فصل خزاں

خس سے بھرپور ہواؤں کے تھپیڑے بے رحم
اہل ثروت کی طرح فصل خزاں کا انداز
کھڑکھڑاہٹ ہے بکھرتے ہوئے پتوں کی مہیب
جیسے چھرّوں کے ہوں نغمات تو بندوق کے ساز

قابل دید ہے بے مہری یارانِ چمن
اب شگوفے ہیں، نہ کلیاں ہیں، نہ ہریالی ہے
رنگ در رنگ جہاں گلبن و گل مہکے تھے
خار ہے یا خس و خاشاک کی اک جالی ہے
میں ہوں بے شاخ نشیمن تو چمن ہے ویراں
نہ وہ پنچھی نہ فضائیں ہیں گل افشانی کی
پیڑ آئینے ہیں اب بے سرو سامانی کے
شاخیں تصویر نظر آتی ہیں حیرانی کی
دردِ حرماں کا مداوا تو ضروری ہو گا
پلٹ آئیں گی وہ گل پوش بہاریں آخر
درد کی لَے میں سہی نغمۂ امید اپنا
کیوں نہ اس حسنِ گلستاں کو پکاریں آخر
ہم جو نغماتِ جنوں خیز میں ڈھل جائیں گے
ان گنت بار یہاں موسمِ گل آئیں گے

-------O-------

امنِ عالم اور محاذِ نو

امنِ عالم اک نئے خطرے سے اب دوچار ہے
ظلمتوں کی، سر زمینِ پاک پر یلغار ہے
جنگ کا یہ دیو، خونی، حیلہ جُو، مکار ہے
موت لیکن اس کے استقبال کو تیار ہے

آدمی بیدار ہے
فتح کا حقدار ہے

سامراجی سازشوں کا اک محاذ نو ہے یہ
سرحدِ لاہور پر اک سازبازِ نو ہے یہ
جنگ میں دزدانہ آنا ترک تازِ نو ہے یہ
کالے، گورے ڈاکوؤں کا ایک رازِ نو ہے یہ

آدمی بیدار ہے
فتح کا حقدار ہے

-------O-------

ایک موسم سرما

موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے
برف سے بڑھ کر خنک موجِ ہوا چلتی ہوئی
اور پلٹ کر زخم کے سے درد میں ڈھلتی ہوئی
سبزہ کی ایک ایک پتی، جان بہ لب، گلتی ہوئی
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے

آدمی سکڑے ہوئے ہیں کوچہ و بازار میں
اہلِ زر اکڑے ہوئے ہیں جلوہ گاہِ یار میں
رقص خانوں میں ہیں یا ہیں ہوٹلوں کے "بار" میں
جل رہی ہے آتشِ حسرت دلِ نادار میں
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے

اہلِ دولت کے یہاں جلتے ہیں ہیٹر یا کریٹ
دائروں، قوسوں، میں بیٹھے وقفِ ناؤ نوش ہیں
موسم گرما کی یادوں میں مگر کھوئے ہوئے
بے نوایانِ تہی جیب و تہی آغوش ہیں
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے

یہ بزعمِ خویش سب عالی نسب، عالی مقام
بھوک کی تیزی کا موسم ہے شکم پرور بھی ہیں
ان کی میزوں پر چکن بھی، ہیمپ بھی، بیکن بھی ہے
اپنے ہی حق میں یہ منعم بھی، کرم پرور بھی ہیں
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے

سج رہے ہیں کس قدر کشمینۂ افرنگ میں
قوسِ تن جن کے نمایاں ہیں لباسِ تنگ میں
دل کشی ایسی کہاں ہو گی کسی ارژنگ میں
ہے کہاں یہ جاذبیت نقشِ رنگ و سنگ میں
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہیں

زر کے بندوں کے یہاں ہیں اون (OWN) ائیر کنڈیشنر
پھینکتے ہیں گرم رومان خیز امواجِ ہوا
تیز دھن پر کرتے ہیں ریکارڈ وہسکی کا اثر
اور کیف مے کو ہیں مہمیز امواج ہوا
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے

دل میں احساسات پر یخ بستگی کا ہے سماں
ذہن میں افکار کی لو منجمد ہوتی ہوئی
گونجتی ہے ذہن میں لیکن ہر اک موج خیال
انقلاب رنگ گلشن پر بضد ہوتی ہوئی
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے

ایک دن فصل بہار آئے گی باغ و راغ میں
عالی و اعلے ستم گر جب نہ ہوں گے باغ میں
شہر و کوہ و دشت میں جب زندگی لہرائے گی
داغ جب ہوں گے، نہ شعلے ہوں گے، دل کے داغ میں
موسم سرما کی باغ و راغ میں یلغار ہے

-------O-------

حسن کا فرہنگ

ہے قلم تیشہ مرا سنگیں حقائق میرے سنگ
روز و شب جن پر لگاتا ہوں میں ضرب نرم و گرم
رفتہ رفتہ ان کے خدّ و خال ابھر جاتے ہیں سب
پھر ٹھٹھکتا ہوں کہ ان کو کیسے مانوں وہ صنم
جن کی آنکھوں اور ہونٹوں میں چمک اور رنگ ہے
اور بدن پھولوں کی صورت نرم ضدِ سنگ ہے
حسن کا فرہنگ ہے
جس کے دم سے من کی ٹھہری جھیل میں آتی ہو لہر
کھلتے ہوں احساس کے وہ دلنشیں رنگیں کنول
جیسے سنگ میل ان دیکھی زمین سحر کے
جن سے رستے جاتے ہوں سوئے طلسماتی محل
جن میں مے بہتی ہو ہر ذرّہ ہو رقص و وجد میں
راگ کی اور رنگ کی لہریں ابھرتی ہوں جہاں
کتنی ہی نادیدہ خوشیوں کے ابھرتے ہوں سماں
جن کا کوئی رنگ اپنے نوک خامہ پر دھروں
اپنی نظموں میں بھروں

تو میں ایسے بت بناؤں جن سے آنکھیں خیرہ ہوں
لیکن ان حالات میں کیا دلکشی پیدا کروں
آبرو جن کی نہیں کوڑی کی بھر اہل حکم
دیتے ہیں الزام غدّاری کدورت ساختہ
جن کا غم کھاتا ہوں پتھر مارتے ہیں وہ مجھے
چشم حیرت دیکھتی ہے با حواسِ باختہ
میں پرستار صنم ہوں اور نہ ہی اصنام گر
میرے ہاتھوں کے جو چہرے آ گئے ہیں سامنے
وہ بھیانک ہوں اگر تو اس میں میرا کیا قصور
کرتے ہیں جلاد پیشہ تو کریں مجھ سے نفور
میں تو خود ان صورتوں سے سخت گھبرا کر کبھی
شہپرِ تخیل کی پرواز سے لیتا ہوں کام
اور نکل جاتا ہوں ان دیکھے جزیروں کی طرف
ڈھونڈ لیتا ہوں کوئی دلکش وفا پیکر وجود
اور اُبھرتے ہیں قلم کی نوک سے اس کے نقوش
لیکن اس پر بھی یہ سارے معترض بدبیں حسود
اک نہ اک مزمن حسینہ یا جمال حاد کو
ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہتے ہیں یہ ان کے نقش ہیں
اس نے شعروں میں انہیں سے کی ہے یہ صورت گری
ورنہ کب حاصل ہے اس کو آج کل کوئی پری
اس کے بھی اعصاب پر ہیں یہ حسینائیں سوار
اور زبانی لذت جنسی کی ہے کاری گری
یا خود اپنی شدت محرومیٔ جنسی سے یہ
تنگ آ کر ہو گیا ہے ایک افسانہ تراش
جن سے لیتا ہے یہ اپنا انتقام بے بسی
مسخ کرتا ہے یہ چہرے ڈال دیتا ہے خراش
ان کی یہ فہرست الزامات ہے لمبی بہت
ان بلند آہنگیوں میں من کی پستی ہے بہت
ان کے ہر سنگین حرف و لفظ کو دیتا ہوں رنگ
میرے خون دل میں جن کے ڈوبتے رہتے ہیں سنگ

جن پہ روز و شب لگاتا ہوں میں ضرب نرم و گرم
رفتہ رفتہ ان کے خدّ و خال ابھر آتے ہیں سب
جن کی آنکھوں اور ہونٹوں میں چمک اور رنگ ہے
پتھروں کی کھردری شکلوں سا اپنا حال ہے
ہے قلم تیشہ مرا، سنگیں حقائق میرے سنگ ......

-------O-------

کشتیٔ اُمیّد

آج پھر کشتیٔ امید مری ٹوٹ گئی
آج پھر وقت کی ہر سانس رکی جاتی ہے
پھر ہے رگ رگ میں غم و درد کی جانکاہ خلش
ہر خوشی اشک کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
آج پھر روح پہ طاری ہے المناک سکوت
آج پھر زیست ہے اک نغمۂ پر درد و خموش
یاس کی ظلمتِ پرہول نے گھیرا ہے مجھے
لطف ہستی ہے نہ جینے کی تمنا کا ہے جوش
میں تھا اک راہ رو گم شدہ منزل لیکن
تو نے ہر وقت سر راہ پکارا تھا مجھے
میں نے جینے کی ہر امید سے منہ موڑا تھا
تو نے جینے کے لئے پھر سے ابھارا تھا مجھے
بن کے خورشید مرے غم کدۂ ہستی میں
تو نے کچھ روز شعاعوں کا فسوں پھونکا تھا
اور تری زلف معنبر کے گھنے سائے میں
میں ہر اک رنج، ہر اک درد، بھلا بیٹھا تھا
آج پھر آ کے اسی رہ پہ مجھے چھوڑ دیا
جس جگہ تو نے کھڑے ہو کے پکارا تھا مجھے
آج ہے دل پہ وہی یاس کا عالم طاری
جبکہ جینے کے لئے تو نے ابھارا تھا مجھے
سوچتا ہوں کہ اسی راہ میں پہلے کی طرح
پھر تیری طرح سے کوئی مجھے آواز نہ دے

اور کوئی ساحل امید دکھا کر اے دوست
اک نئے سُر سے مجھے شوق تگ و تاز نہ دے

-------O-------

نور جہاں

شہی کو پھول جو آیا پسند گلشن میں
تو شاخِ گل سے اسے بے تکان اتار لیا
محل کی بزم شہی کو جو رونقیں بخشیں
تو دن میں ڈوبتے جذبات کو ابھار لیا
لہو میں کوئی نہایا پکار کر تاریخ
مگر سیاہیٔ صفحات بعد میں ابھری
جہاں کسی نے بھی روداد خونچکاں لکھی
سفینہ بن کے تشکک کے بحر میں اتری
یہ پھول جب تھا کلی قصر کے گلستاں میں
کسی کبوتر معصوم کو اڑایا تھا
مورّخ اس کو اسیر ادا بتاتا ہے
دل اس ادا پہ نہیں غنچگی پہ آیا تھا

-------O-------

نافرستادہ جواب

تیری آنکھوں سے آنسو تھے اس دن رواں
میری آنکھیں بھی اشکوں کی تھیں ندّیاں
اور کہا دام غم سے رہا ہو گئے

میں نے سوچا کہ میں آج آزاد ہوں
تم نے سوچا کہ میں آج سے شاد ہوں
یہ نہ سوچا کہ ہم کیا سے کیا ہو گئے

سخت لُو اور کڑکتی ہوئی دھوپ میں
جیسے ہم ڈھل گئے تھے نئے روپ میں
اک نئے راستے پر جدا ہو گئے

اک زمانہ جو گزرا خوشی کی طرح
آج کیوں سوچتی ہو غمی کی طرح
اپنی اپنی انا میں فنا ہو گئے

موت کے بعد اگر ہے کوئی زندگی
وصل بن جائے گی فرقتِ دائمی
ورنہ پتے تھے نذرِ ہوا ہو گئے

-------O-------

خاکِ پاک ارض وطن

اے وطن کے محافظو آؤ !
دیس کی ساری خاک جمع کرو
میرے دامان و جیب و سر میں بھرو
خوب جی بھر کے دھول برساؤ
اے وطن کے محافظو آؤ!

مجھ کو تو خاک پاک ارض وطن
لعل و گوہر سے بھی فزوں تر ہے
حسن اس کا عجب فسوں گر ہے
کیوں نہ مجھ کو اسی میں ملواؤ
اے وطن کے محافظو آؤ !

یہ وہ مٹی ہے جس کی خوشبو سے
مانند ریحان مشک و عنبر ہے
یہ مجھے دوجہاں سے بڑھ کر ہے
بس یہی عطر مجھ پہ چھڑکاؤ

اے وطن کے محافظو آؤ

دل میں ہر لمحہ گھاؤ ڈالو تم
تڑپے یوں جیسے ماہی بے آب
کہ یہ ہے عشق قوم میں بے تاب
کچھ توقف نہ اس میں فرماؤ
اے وطن کے محافظو آؤ

بھول کر بھی اگر زباں پہ کبھی
بے کسوں، بے بسوں، کا آئے نام
پانی پی پی کے مجھ کو دو دشنام
اور غدار مجھ کو ٹھہراؤ
اے وطن کے محافظو آؤ

-------O-------

اعلانِ تاشقند

ظلم کے سامنے طاقت ہو تو ٹل جاتا ہے
ورنہ کمزور کا سینہ بھی کچل جاتا ہے
ضربِ حق، غاصب و کاذب کے لیے ہے کاری
کر کے یہ بات محفل میں سنبھل جاتا ہے
زندہ ہو حوصلہ تو رنگ نمو ہیں لاکھوں
مردہ ہو جسم تو اک رنگ میں گل جاتا ہے
کتنا مشتاق ہے باتوں میں پجاری زر کا
نفع بدلے تو وہ موضوع بدل جاتا ہے
دیوتا اس کے اگر مصلحت آمیز نہ ہوں
ان کی پوجا کے تصور سے بھی جل جاتا ہے
جو درندوں پہ ہے غالب وہی بے باک سلیم
پھول کے رخ پہ ہو آنسو تو ڈھل جاتا ہے

-------O-------

جنگ کر جنگ کر

اے بشر با خبر ہر طرف کر نظر
جو ہیں بیداد گر ان سے ہر گام پر
جنگ کر جنگ کر

مال و جان عزتیں امن کی نعمتیں
عصمتیں، عفتیں ان کو جب ہو خطر
جنگ کر جنگ کر

حد ہے ہر بات کی انتہا رات کی
تیرہ دل ذات کی موت ہے یہ سحر
جنگ کر جنگ کر

چور جب زد میں ہو نیت بد میں ہو
تیری ہی حد میں ہو شیر بن حملہ کر
جنگ کر جنگ کر

امن کے باغ کی کر حفاظت بڑی
اس کی خاطر ہی جی اس کی خاطر ہی مر
جنگ کر جنگ کر

شرق و غرب و شمال یا جنوب جدال
یونہی پائمال لشکر فتنہ گر
جنگ کر جنگ کر

آدمیت ہے یہ رقص عظمت ہے یہ
حفظ عزت ہے یہ توپ کی تال پر
جنگ کر جنگ کر

-------O-------

یلغار

ظالم کی دہکتی ہوئی آنکھوں کو نکالو
اور اس کا لہو بڑھ کے فضاؤں میں اچھالو

انسانوں کی جانوں کا محافظ ہے مقدس
اور کعبۂ مقصود ہر اک حرمت جاں ہے

تقدیس ہے کیا رنگ کمالات بشر کا
جس سے یہ زمیں جنت قدسی صفتاں ہے

مظلوم کی پیکار سے حرماں کا ہے درماں
ہر سانس وگرنہ غم ہستی کا دھواں ہے

-------O-------

ایک پیغام

ہر دشمن انساں کی کلائی کو مروڑو
ہاں آہنی پنجوں سے دلیرو اسے توڑو

میداں ہو، سمندر ہو، فضا کہ خلا ہو
ظالم کو کسی عرصہ ہستی میں نہ چھوڑو

ہاں برق بنو ان کو کرو راکھ کی مانند
آندھی کی طرح ان کے تعاقب میں بھی دوڑو

یہ وقت عمل ہے نہیں اندیشوں کا ہنگام
اب رشتہ کوئی محض تفکر سے نہ جوڑو

خطرات فنا میں ہیں مساوات اخوت
اب بھی جو کوئی خواب میں ہو خوب جھنجھوڑو

ہیں وحدت انسانیت عصر کی کڑیاں
روسی ہوں کہ چینی ہوں وہ کھوکھر ہوں کہ کھوڑو

انسان کو ہے ساری زمیں ارض مقدس
خونخوار جہاں بھی ملیں نخچیر بنا لو

ہو برق بھی تم، مہر جہاں تاب بھی تم ہو
تاریک فضاؤں میں شرر بار اجالو

ہر گام علامت ہو نئی فتح ظفر کی
اے مہر و اخوت کے گلستاں کے نہالو

ہاں دامن حریت پائندہ نہ چھوٹے
اے عرصہ گہ رزم کے بے مثل جیالو

گرگ دہن آلودہ نہ جائیں کہیں بچ کر
تم تیر فضا کی طرح ایک ایک کو جا لو

وہ بحر ہو یا بر وہ فضا ہو کہ خلا ہو
دشمن کو ہر اک عرصہ ہستی سے نکالو

کلیاں جو لٹیں اور جو گھر خاک ہوئے ہیں
ایک ایک کا بدلہ سر میدان وغا لو

-------O-------

غازی

یہ عصر نو اور آدم نو کی یہ زباں ہے
جس ماں کے ہوں فرزند مجاہد وہی ماں ہے

کیا شے ہے جہاد عظمت انسان کے لئے جہد
جو رنگ مساوات و اخوت میں نہاں ہے

جو ظالم و غاصب سے لڑے غازی دوراں
اور گونج جو توپوں کی ہے وہ اس کی اذاں ہے

ہوں عرصہ گہ جنگ پہ میخانے تصدق
رخ اپنا سلیم آج اسی سمت کو موڑو

-------O-------

ایک تمنّا

انساں کا جو عدو ہے اسے زندہ گاڑ دو
اگتا ہو جس میں زہر وہ کھیتی اجاڑ دو

جس سر زمیں میں بہتا ہو مظلوم کا لہو
ظالم کے جبڑے توڑ دو سینہ کو پھاڑ دو

جارح کے غاصبانہ عزائم کے چہرے پر
جو خوشنما نقاب بھی ہو وہ اکھاڑ دو

نازاں اگر ہیں کثرت سامان و فوج پر
مستحصلوں کو توپ کے گولوں کی باڑ دو

جو بے کسوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں ہاتھ
ان کی کتاب زیست کا ہر صفحہ پھاڑ دو

وہ سامراج ہو کہ ہو تجدید رام راج
دونوں کے پاؤں روئے زمیں سے اکھاڑ دو

مارو کچھ اس طرح کہ نہ اٹھے وہ پھر کبھی
ہر سامراجی فوج کا حلیہ بگاڑ دو

-------O-------

اب بھی زندہ ہیں ہم

گو حوادث میں اب تک وہی جان ہے
زور میں آج بھی غم کا طوفان ہے
یاس کی ظلمتوں کا وہی مان ہے
لیکن اپنی بھی اب تک وہی شان ہے
اب بھی زندہ ہیں ہم، اب بھی زندہ ہیں ہم

اب بھی پہلے جو تھی ہے اذیت وہی
ظلم کے ہے شکنجوں میں قوت وہی
لیکن اپنا بھی ہے زور اور طاقت وہی
اور پرستاریٔ آدمیت وہی
اب بھی زندہ ہیں ہم، اب کبھی زندہ ہیں ہم

بہر قوم و وطن و جوش خدمت بھی ہے
اور نظر میں بشر کی اخوت بھی ہے
پاس ناموس اقوام و ملت بھی ہے
اپنے دعوے میں زور اور صداقت بھی ہے
اب بھی زندہ ہیں، ہم اب بھی زندہ ہیں ہم

گوکہ چلتے ہیں لاکھوں ہی چالیں عدو
کوئی مخفی طرح سے کوئی رُوبرو
سبز باغوں کی بھی کرتے ہیں گفتگو
پھر بھی اب تک ہے قائم وہی آبرو
اب بھی زندہ ہیں ہم اب بھی زندہ ہیں ہم

جاں سے پیاری ہے ہم کو زمین وطن
جس کی خوشبو سے ہے مانند مشک ختن
جس کے ذرّے بھی ہیں رشک باغ عدن
جس کے جنت سے بڑھ کر ہیں کوہ و دمن
اب بھی زندہ ہیں ہم، اب بھی زندہ ہیں ہم

راہ میں جو بھی آئے گا ہٹ جائے گا
راستہ کاٹنے والا کٹ جائے گا
ابر ظلمت جو آئے گا چھٹ جائے گا
دیکھ کر ہم کو طوفاں پلٹ جائے گا
اب بھی زندہ ہیں، ہم اب بھی زندہ ہیں ہم

اپنا جینا یہاں اپنا مرنا یہاں
دشمنوں سے لڑیں گے بعزم جواں
ہم سے بچ کر عدو جائے گا بھی کہاں
اس زمین پر تو اس کو نہ دیں گے اماں
اب بھی زندہ ہیں ہم، اب بھی زندہ ہیں ہم

جو بھی ہم پر کرے گا نگاہ ستم
اس کی آنکھوں کو بڑھ کر نکالیں گے ہم
آگے بڑھتا رہے گا ہمارا قدم
دم بہ دم دم بہ دم دم بہ دم دم بہ دم
اب بھی زندہ ہیں ہم اب بھی زندہ ہیں ہم

-------O-------

طبل جنگ

اٹھو اٹھو بڑھو بڑھو عدو کی صف کو چیر دو
جو تیغ بن کے تم اٹھو تو برق بن کے تم گرو
تمہاری زد سے کوئی دشمن بشر نہ دور ہو
مخالفان دائمی کو مژدۂ فنا بنو
جواب گولیوں کا گولیاں ہیں اور تفنگ ہے
ہر ایک نغمہ سے سوا صدائے طبل جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے، صدائے طبل جنگ ہے

سپاہیو دلاورو ہر اک سٹین گن چلے
ہر اک رائفل چلے ہر اک مشین گن چلے

عدو کے مورچے بعجلت تمام ختم ہوں
تمہاری توپ ہو رواں تمہارا ہر پٹن چلے
جواب عہد حاضرہ میں سنگ کا یہ سنگ ہے
ہر ایک نغمہ سے صدائے طبلِ جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے، صدائے طبل جنگ ہے

ہوائے تند و تیز سے تمہارے حوصلے کھلے
تمہاری جراتوں کے ہیں زمانہ بھر میں غلغلے
عدو تمہارے سامنے ابھرتے مٹتے بلبلے
سیاہ بھی، سفید بھی ہیں باؤلے ملے چلے
مگر ہر ایک ان میں اب کٹی ہوئی پتنگ ہے
ہر ایک نغمہ سے سوا صدائے طبل جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے، صدائے طبل جنگ ہے

مثال بحر موجزن نفس نفس قدم قدم
نہ غم بلند و پست کا نہ کوئی فکر بیش و کم
جفا کے حلقے توڑ کر مٹاؤ قصر ہر ستم
ہر اک ہے تم میں محترم ہر اک ہے تم میں محتشم
یہی نوائے امن تھی یہی نوائے جنگ ہے
ہر ایک نغمہ سے سوا صدائے طبل جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے، صدائے طبل جنگ ہے

جو حملہ ہو تو ایک ایک لمحہ وقت تنگ ہے
ہلاکت آفرینوں کا سلسلۂ درنگ ہے
بڑھو پھر آندھیوں کی طرح مقتضائے جنگ ہے
کہ سرعت تمام میں شجاعتوں کا رنگ ہے
یہی حیات آفریں امنگ ہے ترنگ ہے
ہر ایک نغمہ سے سوا صدائے طبل جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے، صدائے طبل جنگ ہے

قدم بڑھا کے انتباہ پر رُکے نہ جب عدو
تو امن کی حفاظتیں اور آدمی کی آبرو
پکارتی ہے سو بہ سو کہ اژدھے ہیں رو برو
سنبھالو تیغ جا چکا ہے وقت ساغر و سبو
کچل دو جو بھی پھن اٹھائے سامنے بھجنگ ہے
ہر ایک نغمہ سے سوا صدائے طبل جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے، صدائے طبل جنگ ہے

عدو کی زد میں ہو اگر تیرا چمن تیرا نگر
ہر ایک حد کو پھاند کر بڑھا ہو سوئے بحر و بر
جو باغ امن و آشتی کو سر بسر اجاڑ دے
اڑائے دھول ہر طرف لگائے آگ ادھر ادھر
تو پھر صدائے جنگ ہی نوائے ساز و چنگ ہے
ہر ایک نغمہ سے سوا صدائے طبل جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے، صدائے طبل جنگ ہے

کسی طرح سے بھی اگر رکے نہ شغل راہ زن
اور اس کی شعلہ آفرینوں کی زد میں ہو چمن
تباہیوں کی زد میں ہو ہر ایک سرو ہر سمن
ہر اک کلی کا بانکپن ہر ایک پھول کی پھبن
تو مدعائے زندگی ہی حفظ باغ ننگ ہے
ہر ایک نغمہ سے سوا صدائے طبل جنگ ہے
صدائے طبل جنگ ہے صدائے طبل جنگ ہے

-------O-------

سمت لاہور جنگی کلال آگئے

ٹینک، طیارے، توپیں، چلاتے ہوئے
ہمتیں اسلحہ سے بڑھاتے ہوئے
رام لچھن کے قصے سناتے ہوئے
دہشتوں سے مگر ڈگمگاتے ہوئے

سمت لاہور جنگی کلال آ گئے

دھیان میں جیم خانہ کی وسکی لئے
وصل خوباں کی لذت پرستی لئے
کشن کی سی نگاہوں میں مستی لئے
ساتھ ہی خوف مرگ و تباہی لئے
ٹڈی دل کی طرح بد خصال آ گئے
کچھ مری کی بیئر (BEAR)ان کے خیالوں میں تھی
کچھ پری کی تخیل اڑانوں میں تھی
گو تعیش کی لہر ان جوانوں میں تھی
ساتھ ہی تھرتھری ان کی جانوں میں تھی
موت کے جال میں بدمال آ گئے
کھیتیوں، بستیوں کو جلاتے ہوئے
امن پرور گھروندوں کو ڈھاتے ہوئے
بچوں بوڑھوں کو جرات دکھاتے ہوئے
ہاتھ سوئے ہوؤں پر اٹھاتے ہوئے
ڈھیر ہونے کو موش و شغال آ گئے
راہ میں عصمتوں کے نگینوں کے چور
عزّت و آبرو کے خزینوں کے چور
داغ معصومیت پر لگاتے ہوئے
نرم کومل گلوں پاک سینوں کے چور
چور کی طرح بہر زوال آ گئے
کثرت ساز و ساماں پہ نازاں بھی تھے
اور عدد میں بہت ہی فراواں بھی تھے
پست ارادوں نے دیں جنبشیں بھی بہت
اور خونی ارادوں کے طوفاں بھی تھے
موت سے کر کے رنگیں سوال آ گئے
ہاں یہ خونی ڈویژن جو دشمن کی تھی
اپنے خوابوں کی شمشان بھومی بنی
شہر لاہور تو اب بھی آباد ہے

قسمت حملہ اور تباہی بنی
ضرب آہن کی زد میں سفال آ گئے
ان کے خوابوں کی تعبیر مرگ بدی
ان کی لاشوں کی تقدیر بدبو گری
جیم خانہ کی وسکی مری کی بیئر
"اب بھی ہے" ان کی پتھرائی آنکھوں میں بھی
وہ جو سرحد پہ بہر قتال آ گئے

-------O-------

ہر بدگماں مٹ جائے گا

آخر زمیں پر ظلم کا نام و نشاں مٹ جائے گا
ظالم اگر ہے آسماں یہ آسماں مٹ جائے گا
وقت مکافات عمل ہر سامراجی کا ہے یہ
جو بھیڑیا ہے جس جگہ خوں در دہاں مٹ جائے گا
کشمیر ہو، وت نام ہو یا دشت صحرائے عرب
خونی لٹیرے سن رکھیں ہر دُزدِ جاں مٹ جائے گا
بحر بشر ہے جوش میں ہر خار و خس مٹنے کو ہے
بیڑا جو بد خواہوں کا ہے وہ بے گماں مٹ جائے گا
غاصب کے حق میں موت ہے وہ ہو پرانا یا نیا
امریکی اور امریک سنگھ آتش بجاں مٹ جائے گا
جس باغ میں موج ہوا ہر پھول پر ہو نوحہ خواں
صیاد تو صیاد ہے خود باغباں مٹ جائے گا
مایوسیوں کی بدلیاں چھٹنے لگی ہیں ہر طرف
ہر دشمن انساں سلیم اب بے گماں مٹ جائے گا

-------O-------

فانوس آزادی

شہیدوں کا لہو ہے تابش فانوس آزادی

اسی سے ہے حصار حفظ میں ناموس آزادی
عمل میں ڈھل کے تاباں جب ہوئے افکار آزادی
ہوئی منزل قدم بوس علم بردار آزادی
لہو کی ندیاں اور آگ کے طوفاں سے گزریں گے
کہ ہر محکوم خطے میں ہے اب پیکار آزادی
ہر اک قصر و محل جور و ستم سرنگوں ہو گا
کہ سیل بے کراں بن کر اٹھے سر شار آزادی
سماعت میں اسی سے نغمہ ایثار گونجا ہے
عمل کی جان بھی ہے، شان بھی ہے، کوس آزادی
یہ دور جہد انسانی ہے شاعر کو بھی لازم ہے
کہ وہ ہو شاعر امروز و فخر طوسِ آزادی
بیک ضربت در و دیوار زنداں توڑ دیتے ہیں
اگر شیروں کو ہو بیتابی پابوس آزادی
حصار سنگ و آہن ہو سلاخیں ہوں کہ زنجیریں
اڑا دیتے ہیں ٹکڑے کر کے ناما یوس آزادی
ملا ہے عشق کا بھی نام اُنس آدمیت کو
پرستار وفا ہیں اس لیے مانوس آزادی
عجب کیا ہے کہ خیرہ چشم ہو کر ظلم مٹ جائے
کہ سجتا ہے بقا کے جسم پر ملبوس آزادی
ابد تک جس کے اک اک حرف میں تابندگی ہو گی
سلیم اب ہم رقم کرتے ہیں وہ قاموس آزادی

-------O-------

پاک سرحد

پاک سرحد کی طرف دبکے ہوئے
جان بُل اور سام کے چیلے بڑھے
جس طرح پھونکارتے افعی بڑھیں
یا بڑھیں شعلے اگلتے اژدھے
جی میں اندیشے کہ ان کا سر بھی توڑا جائے گا
ارض کشمیر اک پرانا زخم تھا

اک نئے ناسور کا ساماں ہوا
اک نئے چیلے سے کٹ پتلی بڑھے
نام جس کا جنگ ہندوستاں ہوا
لیکن ان کٹھ پتلیوں کو بھی جلایا جائے گا
سامراجی جنگ بے اعلان جنگ
رام سے ہیں رام کی ہم کاریاں
فوج کی ضرب آہنی عزم عوام
ہر قدم پر ان کو دیں گی خواریاں
حملہ آور کو بہر صورت مٹایا جائے گا
آستین پر خوں دامن پر لہو
دیو استبداد بوکھلایا ہوا
یہ سمجھتا ہے کہ بحر و بر پہ ہے
دیوتاؤں کی طرح چھایا ہوا
خوں کا بدلہ خون ہے لیکن چکایا جائے گا
خون افریقہ میں ہو یا ایشیا میں خون ہے
خونیوں کے سارے ہی اعمال تولے جائیں گے
دیو گورے ہوں کہ کالے سرنگوں ہو جائیں گے
ظلم کے پنجے بہر صورت مروڑے جائیں گے
دام استبداد کا ہر حلقہ توڑا جائے گا
پاک سرحد، ویت نام، آتش فشاں کشمیر بھی
اور فلسطینی زمیں آتش فشاں ہیں آگ ہیں
جس قدر بھی اژدھے ہیں ان کی ٹوٹے گی کمر
آگ کا لقمہ بنیں گے جس قدر بھی ناگ ہیں
آگ میں ہر اژدھا و مار ڈالا جائے گا
پتلیوں کے ساتھ بازی گر بھی ہیں مصروف جنگ
لندن و واشنگٹن ان کے استان سروری
چھوٹے بازی گر ہوں چاہے ویت نام و ہند میں
عالمی سرمایہ داروں سے ہے یہ بازی گری
لیکن ان کا ایک اک مرکز مٹایا جائے گا
آج بحر و بر میں یہ آواز ہے گونجی ہوئی

بے کسوں کو ان کے سارے حق دلائے جائیں گے
جتنے بازی گر ہیں آخر جنگ ہاریں گے ضرور
جتنے بھی ہیں سامراجی کتے مارے جائیں گے
اور جنت ساری دنیا کو بنایا جائے گا

-------O-------

حصار حصیں

ہے وطن انسانیت، امن ہے اس کی زمیں
امن ہے بالیدگی، امن بہشت بریں
امن نظام چمن، امن قیام وطن
امن حیات چمن، امن حیات آفریں
امن ہے سلماؤں کا حسن، وفا کا حصار
امن ہے عذراؤں کا خاتم و نقش و نگیں
امن ہے ہر ذرہ میں نشو و نما کی پھبن
امن سجل آسماں، امن سجل سر زمیں
امن سے ہیں کھیتیاں امن سے ہیں بستیاں
امن ہے سد عظیم، امن ہے دیوار چیں
امن حقیقی میں ہے مہر و اخوت کا راج
ہے کوئی عامی جہاں اور نہ کوئی ہے کمتریں
امن سے ہے ارتقا، امن سے رنگ بقا
امن خوشی کی صدا، قاطع صوت حزیں
امن کمال بشر امن جمال بشر
شہر وفا کے لئے، امن حصار حصیں

-------O-------

محاذ لاہور
۱۷ ستمبر ۱۹۶۵ء

غازیوں اور شہیدوں کا ہر طنطنہ

ہر قدم ہر عمل اور ہر واقعہ
اک نہ اک جاودانی فسانہ بنا
ایڈیٹر سے اک کارنامہ بنا
ایک گولے سے اس میں خرابی ہوئی
اور درستی کی خاطر شتابی ہوئی
گولے آتے رہے جسم کٹتے رہے
بم بھی نزدیک اور دُور پھٹتے رہے
گولیاں مینہ کی صورت برستی رہیں
اڑتے سانپوں کی مانند ڈستی رہیں
دُھول اڑتی رہی، شور بڑھتا رہا
حملے کا ہر طرف زور بڑھتا رہا
حملہ آور کے جب ٹینک بڑھنے لگے
نوجواں سیج کی طرح چڑھنے لگے
ہر طرف تھا دھواں، شعلے تھے، گونج تھی
اور فضا میں لپک بے اماں آگ کی
سرحد پاک کے یہ محافظ مگر
بادہ فرض سے مست و مخمور تر

-------O-------

چونڈہ

حملہ آور کی توپیں دنا دن چلیں
گولیاں بھی تڑاتڑ تڑاتڑ بڑھیں
ٹینک بھی دو دواں گرڑ گڑ گڑ چلے
بکتری گاڑیاں رک کے بڑھتی رہیں
ساتھ مگ، ہنٹر اور جٹ بھی لے کر بڑھے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

دونوں جانب سے شعلے لپکنے لگے
راکھ میں کھیت کھلیان ڈھلنے لگے

دونوں جانب سے شعلے لپکنے لگے
راکھ میں کھیت کھلیان ڈھلنے لگے
جھاڑیاں تک اکھڑ کر فضا میں اُڑیں
ٹکڑے ہو ہو کے اشجار جلنے لگے
دشمن آدمی بھسم ہونے لگے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

ہر طرف آگ تھی، دھول تھی اور دھواں
جنگی نعروں سے بھرپور تھا آسماں
چاروں جانب تھے فوارے خوں کے رواں
موت نے چن لئے تھے عدوئے اماں
مولی گاجر کی صورت جو ہر سو کٹے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

امن اور آشتی کے مظاہر مٹے
سارے تسکین پرور مناظر مٹے
کچے پکے گھروندے ہوئے سرنگوں
گھر تو گھر تھے کئی اک مقابر مٹے
حملہ آور مگر پشت کر کے رہے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

واقعہ ہے ستمبر کی سات آٹھ کا
جب عدو سمت لاہور ناکام تھا
چور کی طرح چھپ چھپ کے بڑھتا ہوا
پوری طاقت سے ہر حملہ آور بڑھا
خاک و خوں میں مگر وہ نہائے گئے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

دس ستمبر کو پھر اک لڑائی ہوئی
جس میں جے سی کی رجمنٹ آگے بڑھی
پاک فوجوں کی دیکھی جو برق افگنی
چار گھنٹوں میں ہی تہس اور نہس تھی
اپنے ہی حوصلوں کی طرح وہ مٹے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

فخر ہند ان کا تھا نام سو مٹ گئے
ہند کو جگ ہنسائی کا تحفہ ملا
سور کی طرح یہ سورما مٹ گیا
جو شکاری تھا سوروں کا بے مثل تھا
ان میں کچھ آگے بڑھ بڑھ کر مٹتے رہے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

پھر وہی کالے ہاتھی جو لائے گے
آٹھ ایک ایک گھنٹے میں ڈھائے گئے
ان کے بمبار اور فائٹر بھی بہت
ٹڈیوں کی طرح سے گرائے گئے
یوں ہوائی مہاشے بھی ان کے اڑے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

بے کفن، بے چتا تھے وہ جتنے مٹے
ان کے کریا کرم کرنے والے نہ تھے
بدحواسی میں کچھ اور بھی وہ مرے
ان کے اپنے بھی گولے انھیں پر پھٹے
موت کے دوہرے ہاتھوں سے مارے گئے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

ہاں ستمبر کی انیسویں رات کو
ایک اک کی جگہ لائے وہ سات کو
روشنی کے بھی گولے چلائے گئے
بجلیوں کی کڑک جیسے برسات کو
پا لیا جنگی بارات کو موت نے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

بھاری ٹینکوں میں ان کے جو دستے بڑھے
راجہ پورس کے بھی ہاتھیوں سے بڑھے
اپنے ہی ساتھیوں کو کچلتے بڑھے
یوں عدم کی طرف یہ مہاشے بڑھے
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے وہ بھی جھلسے ہوئے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

ہر طرف سخت گھمسان کا رن پڑا
کر لیا بزدلوں سے جو کچھ بن پڑا
کر کے اکتا جو ایک ایک راون بڑھا
راہ میں قلعہ تھا وہ جو بھی مسکن پڑا
اپنی شمشان کو کر کے سنگھٹن بڑھے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

بزدل اپنی نظر میں تھے فرزانہ بھی
تھے کمینے بھی اور جنگجویانہ بھی
سخت حملہ ظفر وال پر بھی رہا
ان کی زد میں پھلورہ تھا بڈھیانہ بھی
مٹ گئے وہ پرے بن کے آتے ہوئے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

تیرہ سو گز سے بھی جتنے گولے چلے
چھ سو گز فاصلے کی طرح سے لگے
بکتری گاڑیاں، ٹینک، توپیں چلیں
بھارتی سورما ڈھیر ہوتے رہے
آگ، خون اور دھواں بن کے ظالم مٹے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

جو بچے وہ یہاں سے فراری ہوئے
وقفِ ذلّت ہوئے نذرِ خواری ہوئے
پاک سرحد سے پیچھے پلٹتے رہے
اپنی قسمت کے شاکی جواری رہے
اُن کا بھی غم رہا جو فنا ہو گئے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

ہاں یہاں پر جو زور آزمائی ہوئی
پانی پت کی بھی جنگوں سے بڑھ کر رہی
چھا گئی ان پہ کچھ ایسی چیتاونی
موت کی ان کی آنکھوں میں تھی چھاونی
غم تھا ان کا جو میداں میں مارے گئے
پھر چونڈھ کے کھیت ان کے مدفن بنے

جیتنے رانا تھے اور پرتھوی راج تھے
موت کی سرزمیں کے مہاراج تھے
ان کے جتنے بھی گڑھ مورچے تھے بنے
پاک فوجوں کے ہاتھوں سے تاراج تھے
حملہ آور گلے مل گئے خاک سے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

جب ستمبر کا تیسواں دن چڑھا
بزم اقوام کا واسطہ آ پڑا
سورماؤں کی جانوں میں جان آ گئی
شانتی کا انھیں دھیان آنے لگا
پھر گنا ساتھیوں کو جو یدھ میں کھپے
پھر چونڈہ کے کھیت ان کے مدفن بنے

-------O-------

چاند ماری کرنے والے

فصیلیں بھر گئی ہیں چاند ماری کرنے والوں سے
جو ان کا بس چلے تو چاند کی بھی دھول اڑ جائے
فروغ آگہی سے اہل ظلم کتنے خائف ہیں ؟
چمک پھولوں میں آ جائے تو اک اک پھول اڑ جائے
یہ جنگیں مرمریں آقاؤں کے حکم تعیش پر
حصار عیش و دیوار طرب تعمیر کرتے ہیں
مگر شب خون حریت کے روشن دھماکے پر
سگ ناپاک کے مانند وہ خندق میں مرتے ہیں
ٹرک طیارے توپیں ٹینک بھی اور ائرگن بھی
شکار آدمی کے شغل کا سامان بہت کچھ ہے
انھیں کے حق میں دام مرگ ان کی جارحیت ہے
جو سمجھے تھے کہ خون ریزی کا کام آساں بہت کچھ ہے
انھیں مے کا نشہ ہے اور حسیناؤں کا نشہ بھی
مگر نشوں کی دنیا میں بھی دیو مرگ ہنستا ہے
بہت سی زندہ لاشیں خلوت و جلوت میں بکتی ہیں
مگر ہر لاش کو غداریوں کا خوف ڈستا ہے
یہ اپنے سائے پر بھی اپنی توپیں داغ دیتے ہیں
زمین چھدتی ہے گولوں سے فضا کو چھان لیتے ہیں

چلا کر مارٹر بھی، رائفل بھی، گن مشینیں بھی
غلط فہمی بتا کر اپنی دہشت مان لیتے ہیں
گھرا ہے ان فصیلوں سے ہر اک شہر اور ہر قصبہ
مگر آواز حریت فضا میں گونج اٹھتی ہے
اخوت کے ترانے ویٹ نامی جب بھی گاتے ہیں
نوائے فتح ہر موج ہوا میں گونج اٹھتی ہے
ستم کاروں کے حق میں برق ہیں افواج آزادی
فصلیں ٹوٹتی جاتی ہیں پیہم چاند ماروں کی
ہر اک یلغار، ہر آواز پا پیغام دیتی ہے
کہ فتح گلشن ہستی مقدر ہے بہاروں کی

-------O-------

آہ! قائداعظم

(قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال پر)

کس قدر ہے انقلاب آگیں گزر گاہِ حیات
کون ہے جز ذات حق جس کو میسر ہے ثبات
مشعل مہر فروزاں ہے ضیا ساماں اگر
ڈھانپ لیتی ہے اسے پردوں میں پھر تاریک رات
ذرّہ ذرّہ بزمِ ہستی کا فنا انجام ہے
ہے فنا کی گردشوں کی زد میں ساری کائنات
آہ یہ شغلِ مشیت! آہ یہ فطرت کا کھیل
جس سے بچنا ہے فقط منجملۂ ناممکنات
دستِ قدرت نے تجھے بھی کر دیا ہم سے جدا
رو رہی ہے آج تیرے غم میں ساری کائنات
سر بہ زانو ہے ترے غم میں ہر اک برناؤ پیر
تیرا غم ہے آج دامن گیر بزم شش جہات
اب سیاست کے معمّے ہم کو سمجھائے گا کون
اب عدو کے بد ارادوں کی خبر پائے گا کون
کون اب سلجھائے گا الجھی ہوئی راہوں کے پیچ
اور منزل تک پہنچنے کی خبر لائے گا کون
کون بن کر رعد گرجے گا سر اغیار پر
اور بدخواہوں کے حق میں برق بن جائے گا کون
کون ہو گا آندھیوں کے سامنے سینہ سپر
اور باطل کی صفوں کو چیرتا جائے گا کون

-------O-------

حُسنِ کامل

ترا حسن کم سن حسیناؤں کے حسن سے کچھ سوا ہے
کہ ان میں یہ تیرے بدن کا سارس ہے نہ ہے وہ نزاکت
نہ حسن وادا ہے
مجھے کچی کلیوں کی جلوہ گری سے نہ مطلب
نہ شیدا ہوں ان کونپلوں کا
جو رنگوں کے جادو جگاتی ہیں لیکن ہے رس جن میں کوئی
نہ خوشبو ہے کوئی
مجھے ایسے گل سے محبت ہے جو سارے گلشن میں یکتا ہے اپنی پھبن کا
وہ جس کو گزرتی ہوئی دھوپ چھاؤں کمالات حسن واثر بخشتی ہو
ابھرتی ہوئی وقت کی رو جسے پیار پہچاننے کی نظر بخشتی ہو
جو ہو اور پھولوں میں یکتا چمن میں
کہ میں بھی ہوں تنہا وفا کے چلن میں
ترا روپ ڈھل سا گیا ہے تو کیا ہے کہ کونپل کا ڈھلنا
ثمر کے لئے ہے
مگر کر کے ناپختگی کا بہانہ کسی اور کی گود میں گر نہ جانا
کہ تو کچی کلیوں سے اور کونپلوں سے جدا ہے
ترا حسن بھی کچھ سوا ہے

-------O-------

ہوا چل رہی ہے

شگوفے ہیں رقصاں ہوا چل رہی ہے
ہر اک سمت پھلواریاں جھومتی ہیں
پر افشاں ہے جن سے کچھ ایسی ہی خوشبو کہ جیسے
اسی کے بدن کی مہک ہو
جو میری نظر میں سمائی ہوئی ہے
شگوفے ہیں رقصاں

ہوا چل رہی ہے
درختوں کے پتوں کی ہر سرسراہٹ
طلسمات کی موج میں ڈھل رہی ہے
ہے جیسے رگ و پے میں وہ سنسناہٹ کہ جیسے
وہی گلبدن چل رہی ہے
جو میرے خیالوں پہ چھائی ہوئی ہے
ہوا چل رہی ہے
بگولے ہیں رقصاں ہوا چل رہی ہے
جیسے وہ طرارے بھرتی غزالہ خود اپنے ہی
افسوں سے رقصاں ہوئی ہے
سماعت میں جس کے لباس حریری کی سی سرسراہٹ
ترنم فشاں ہے
جو جادو جگانے پہ آئی ہوئی ہے
ہوا چل رہی ہے
اڑے جا رہے ہیں کچھ اس طرح بادل کہ جیسے
اسی نے بکھیرا ہو آنچل
جو میرے تصور پہ چھائی ہوئی ہے
جہاں اس کی رفتار ہی کا ہے جادو
کہ جس سے ہزاروں دیئے سے ہیں روشن
جو موج طلسمات میں ڈھل رہی ہے
ہوا چل رہی ہے

-------O-------

نگارِ صبح

وہ بامِ افق سے سحر جھانکتی ہے
جہاں سے ابھرتی ہوئی سرمئی روشنی ہر طرف
پرفشاں ہو رہی ہے
اندھیروں کی نبضیں ہیں ٹوٹی ہوئی
سانس گم ہے جنازہ چلا ہے

جنھیں چند تارے لئے جا رہے ہیں
جو دشت زمرد میں اب بھی ہیں روشن
جو اپنی لرزتی ہوئی روشنی کی زباں سے
مسلسل یہی کہہ رہے ہیں
وہ بام افق سے سحر جھانکتی ہے
گھنے شاخساروں میں جاگے ہیں پنچھی
ترنم کا سیلاب سا بہہ رہا ہے
نئی صبح کے چھڑ گئے ہیں ترانے
مدھر تان میں ایک اک طائر خوشنوا
پیچھا کر رہا ہے
وہ بام افق سے سحر جھانکتی ہے
صبا چل رہی ہے
ہر اک سمت کلیوں نے کھولی ہیں آنکھیں
جو ہیں منتظر ان روپہلی شعاؤں
کی جو پر فشاں ہوں گی سطح زمین پر
جو خاموش پیغام میں کہہ رہی ہیں
کہ کچھ دیر میں اب ہے وہ آنے والا
وہ جس سے زمانے میں ہوگا اجالا
جو تابش فزا ہوگا تاب آفریں بھی
وہ جس کے نفس سے فلک پر
ستاروں میں سیاروں میں زندگی ہے
وہ دیکھو افق سے سحر جھانکتی ہے
یہ مانا کہ یہ ساعت معتبر ہے
یہ خاموش آواز میں کہہ رہی ہے
وہ بام افق سے سحر جھانکتی ہے
نظر دیکھتی ہے
سماعت میں آوازیں بھی گونجتی ہیں
یقیں بھی ہے لیکن
گئی شب کہ پیہم فشار ممات آفریں نے
جو بے جان و بے حس کیا ہے

نئی نسیم جانی یہی ہے
جو اندیشہ بن کر ابھرتی ہے دل میں
کہ جب تک وہ جلوہ نمائی کرے گا
تن و جسم کا ربط باقی بھی ہوگا؟
کہ اپنا بھی اب عالم جاں کنی ہے
وہ بام افق سے سحر جھانکتی ہے

-------O-------

ایک بحری سفر

فضائے ساحل میں ارتعاش خفی ہوئی یک بہ یک نمایاں
بلند گولے، رسیلی آواز، ہوگئی ہر طرف پرافشاں
کہ ملنے والے کنارے جائیں، جہاز لنگر اٹھا رہا ہے
کشادہ ساحل کے سامنے اب سفینے کا، شہر آرزو کا
جو سینہ آب پر رکا ہے
قیام اب اختتام پر ہے
کوئی غمیں ہے
کسی کی پلکوں پہ ہیں ستارے
کوئی تبسم لٹا رہا ہے
کسی کو ساماں کی فکر
کوئی وداع کرتے ہوئے رفیقوں کی
رخصتی گفتگو میں گم ہے
کوئی جدائی سے مضمحل ہے
کوئی جدا ہو رہا ہے لیکن غم جدائی چھپا رہا ہے
کوئی طربناک فکر منزل میں بیکراں بحر کے نظاروں میں کھو گیا ہے
کوئی کناروں کی سمت کوئی نظریں ہٹا رہا ہے
فضا میں پھر ارتعاش ہے وہ رسیلی آواز گونجتی ہے
جو کہہ رہی ہے کہ ملنے والے سفینہ چھوڑیں
کنارے اتریں
جہاز لنگر اٹھا رہا ہے
جہاز میں مچ گئی ہے ہلچل جو آنے والے ہیں، جا رہے ہیں

کئی کنارے کھڑے سفینے کی سمت نظریں اٹھا رہے ہیں
ہوا میں کرتے ہیں کتنے رومال آخری رخصتی اشارے
بہت سے لہرائے ہاتھ جیسے مسافروں کو بلا رہے ہوں
یہ کہہ رہے ہوں کہ جانے والو کہاں چلے ہو پلٹ بھی آؤ
پلٹ بھی آؤ ابھی نہ جاؤ ابھی تو وقت سفر نہیں ہے
ادھر سے بھی ہو چکے اشارے
اُدھر سے بھی ہو گئے اشارے
وہ سطح خاموش پر ہوئے کتنے حلقہ نیلگوں نمایاں
سفینہ لنگر اٹھا کے خاموش پر سکوں نیلگوں سمندر میں
دھیرے دھیرے سے بڑھ رہا ہے
بہت سے حجروں میں جا چکے ہیں
بہت سے عرشے پر آگئے ہیں
مساحت بحر بڑھ رہا ہے
کنارے پیچھے سرک رہے ہیں
کچھ اور آگے بڑھا سفینہ
کچھ اور پیچھے ہٹے کنارے
سفینہ اب گہرے پانیوں میں رواں ہے ساحل نکل چکا ہے
ہر ایک کے دل میں دھیرے دھیرے خیال منزل ابھر رہا ہے
وہ حلقہ آب امنڈ رہے ہیں وہ موج رفتار بڑھ رہی ہے
سفینہ اب موج تندرو سے بھی تند تر بحر میں رواں ہے
یہاں نہیں اب کوئی کنارا
یہاں نہیں اب کوئی بھی ساحل
مگر کہیں دور اک نہ اک ساحل اور کنارا ہر اک مسافر کا منتظر ہے
ہر اک کی منزل کا ہے تعین
ہر ایک کی منزل سفر ہے
یہ بحر اگرچہ ورائے حد نظر ہے بحر عدم نہیں ہے
وہ بحر جس کی مہیب تاریکیوں میں راہوں
نہ منزلوں کی کوئی خبر ہے
جہاں ہر اک کا سفینۂ زندگی کسی دن رواں نہ ہوگا
سلیم جب اپنی زندگی کا سفینہ چل دے گا منزل بے نشاں کی جانب

کسے خبر ہوگی کونسی ساعت جدائی ہے کونسی منزل سفر ہے
کوئی نہ ہوگا جو روک پائے
کہے مسافر ابھی نہ جاؤ
ابھی تو وقت سفر نہیں ہے
اگر کوئی روکنا بھی چاہے گا موج احساس تک نہ ہوگی
جو دل میں طوفان غم اٹھائے
کہاں کا دل، دل تو اپنی رفتار بھول جائے گا
جیسے صدیوں سے صورت سنگ یوں ہی خاموش ہی رہا ہے
نظر پپوٹوں کے سخت و سنگیں حصار میں بند ہو کے
آنکھوں میں لوٹ آئے گی
منجمد ہو کے گر پڑے گی
نہ دیکھ پائے گی کوئی پوشیدہ راحتوں سے دمک رہا ہے
کہ فرط غم سے دہک رہا ہے
سماعت و حس خنک یخ آلود سرد لہروں میں جا ملے گی
جہاں تک آواز اور مس کی کوئی رسائی نہ ہو سکے گی
ہر ایک شے دھیرے دھیرے تاریکیوں کی آغوش میں بڑھے گی
خبر نہ ہوگی کہ کوئی ہچکی کے ساز پر غم کے رخصتی گیت گا رہا ہے
کوئی نہ ہوگا جو وقت رخصت کوئی قدم ساتھ ساتھ جائے
کوئی کہے گا گیا مسافر
مگر مسافر تو بے خبر ہوگا جب سفینہ روانہ ہوگا

-------O-------

یہ دوست

یہ پیار ~~سے~~ یہ دشمن خفی، جن کی دوستی ننگِ دوستی ہے
یہ پیارے لفظوں میں اپنے باطن کا سم قاتل چھپانے والے
محبتوں کے ہزاروں جادو بھرے فسانے سنانے والے
طرح طرح ڈنگ آزما کر نئے نئے روپ دھارتے ہیں
وفازدوں کو پکارتے ہیں
یہ خوش نما ناگ ہیں ہمیں غفلت محبت ہیں ڈس رہے ہیں
مگر فرشتوں کا روپ دھارے خوشی کے پیغام دے رہے ہیں

یہ پیار کے دلفریب انداز میں ہر ایک زخم دل میں نشتر اتارتے ہیں
یہ دل کے ہر گھاؤ کو مسل کر
مسرتوں کو سنوارتے ہیں
یہ دشمن دوستی ہمیشہ یونہی رہے ہیں یونہی رہیں گے
یہ ہیں وہ معصومیت کے رہزن
یہ ہیں وہ سوداگر محبت
جو اپنی جھوٹی محبتوں کے لئے جہاں کو پکارتے ہیں
یہ مکروفن کے مہیب پیکر
فضا کی غمگین اور بوجھل فسردگی کا گلہ کریں گے
جراحتوں کے چمن کھلائیں گے عشرتوں کے فسانے کہہ کر
مگر یہ خود ہی مسرتوں کے دیئے بجھائیں گے اور کہیں گے
فضائیں تاب آفریں نہیں ہیں
مہیب بے رحم ظالمانہ خفی ارادوں سے یہ ستمگر
ستم ظریفانہ لے میں رگ رگ میں زہر اتاریں گے اور کہیں گے
ہم آسماں سے زمیں پہ اترے کہ دوستوں کی فسردگی کو
شگفتگی میں بدل کے رکھ دیں
یہ خوش نما خوفناک حیواں نہیں جن کی مہروفا کے پردے میں
سم قاتل دھرا ہوا ہے
یہ روح کی پیاس ساغر زہر سے بجھاتے ہیں
دوستی کا فریب دے کر یہی ہیں جعفر یہی بروٹس
جنھوں نے ٹیپو کو اور سیزر کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنا جام صحت پیا
چہک کر
یہی وہ ساتھی ہیں وہ حواری
جنھوں نے پیہم گواہیاں دے کے پور مریم کو دار پر جلوہ گر کیا تھا
صحیفہ دوستی میں اک نئے باب کا اضافہ
عجیب عنوان سے کیا تھا
فریب مہروفا دیا تھا
فغاں کہ ان دوستوں کی زد سے کہیں بھی کوئی اماں نہیں ہے
یہ چپکے چپکے سے دھیرے دھیرے سے
روح کی خلوتوں میں اُتریں گے

اور مار سیاہ بن بن کے
ہر مسرت بھری تمنا کو یوں ڈسیں گے
کہ زندگی ایک لڑکھڑاتی ہوئی صدا بن کے ڈوب جائے
فنا کا نغمہ مہیب نغمہ
تمام کیف آفریں سروں کی نقاب اوڑھے ہوئے ہر اک آرزو پہ چھائے
کوئی تمنا اماں نہ پائے
فغاں کہ انساں کی روح کی پیاس ساغر زہر بے اماں سے بجھائی جائے
فغاں کہ انساں سدا ہر اک جو فروش گندم نما سے مل کر
محبتوں کے فریب کھائے

-------O-------

آنکھیں ہی آنکھیں

لاکھوں رخ کھول کر
لاکھوں رُخ ڈھانپ کر
سامنے آ کے جلوے لٹاتی رہیں
اور آنکھوں کی چلمن سے تکتی ہوئی
اپنی بے تاب روحیں دکھاتی رہیں
کتنی آنکھوں میں چاہت کی دعوت بھی تھی
کتنی آنکھوں میں بس آ تھا یعنی کہ آ
کتنی آنکھوں میں حیرت بھی تھی موجزن
میری دوریش طبعی مری بے نیازی مری آن پر
سال ہا سال شام و سحریوں ہی آنکھیں ہی آنکھیں مجھے دیکھتی ہی رہیں
دل مگر تیرے غم میں مگن ہی رہا
درد کا لہلہاتا چمن ہی رہا
میری آنکھوں کے روزن سے جو بھی مری روح کی وسعتوں تک گئی
تیرے رنگیں تصور میں ڈھلتی رہی
شعلہ عشق صد رنگ جلتا رہا
لیکن اب کچھ حسینائیں جن کو شکستیں ملیں
پست ہونے کا طعنہ مجھے دے رہی ہیں بہت

کہہ رہی ہیں تب وتاب و کیف جوانی کے دن جا چکے

-------O-------

دنیا

ولولوں جوش امنگوں کے دن جا چکے
چاند تاروں کو چھونے کے دن جا چکے
یہ دنیا یہ زاغ وزغن بوم و کرگس کی آماجگاہِ حقیر
سدا اپنی پہنائیوں میں ہزاروں فسوں کار جلووں کی سحر آفرینی میں مشغول ہے
ہر اک سحر آگیں تجلی
کسی ساحرہ کی طرح دامن دل پکڑتی ہے، کہتی ہے آؤ
ہمیں اپنی پہنائیوں میں اتارو
شبستانِ خوابِ طرب میں بساؤ
یہ دنیا یہ خونخوار انساں نما چار پایوں کی اک جنت عشرت وشادمانی
یہ رقص بہیمانۂ بے اماں کا ٹھکانا
یہ خونخوار امیدوں کا آہنگ خانہ
ہوا وہوس کے ترانوں سے معمور ہے
ترانے جو کہتے ہیں ہر آسماں کی بلندی فریب نظر کے سوا کچھ نہیں ہے
بلندی سے اترو بلندی میں کیا ہے، خلا ہی خلا ہے
ہر آہنگ کہتا ہے غم کا مداوا فقط پستیوں میں میسر رہے گا
جہاں درد کے جاں ستاں لشکروں پر ہے عشرت کے شبخوں سے جانکاہ ہلچل
جہاں یاس کو اپنے قلعوں فصیلوں پناہ خفی میں اماں تک نہیں ہے
جہاں عیش کا حملہ چنگیز و تیمور و نادر کا سا حملہ بے اماں ہے
ہر اک نقش پستی نئے زاویوں نت نئی دھن سے کہتا ہے آؤ
ہماری طرف آؤ عیش و طرب کے فسانے سناؤ
بلندی سے اترو
سمجھ لو بلندی فریب نظر کے سوا کچھ نہیں ہے
مگر کون بیداریوں میں بھی سوئے ہوؤں کو بلندی کے عالم دکھائے
حسیں آسماں کی طرف زحمت یک نظر کے لئے ان کو پیہم بلائے

دکھائے بلندی میں شمس و قمر ہیں
ستارے ہیں جن کی حسیں ضو کی معصومیت سے فضا کے طرب زار معمور
ہیں
یہ ارض و سما کیا، یہ انسان کیا، دوجہاں ان کے جلووں سے مسرور ہیں

-------O-------

یہ کیسا عالم ہے

منتشر ہو گئی ہے بزم امید
یاس ہی یاس ہے نگاہوں میں
ڈھل چکی ہے نشاط کی دنیا
گرم اشکوں میں سرد آہوں میں
چھا رہے ہیں اداسیوں کے غبار
ماہ و انجم کی جلوہ گاہوں میں
کھو گیا قافلہ مسرت کا
غم کی الجھی ہوئی سی راہوں میں
پھیلتی جا رہی ہے ظلمت یاس
آرزو ڈھل رہی ہے آہوں میں
سو گئے جاگتے ہوئے فتنے
تری سحر آفریں نگاہوں میں
لذتوں کا خمار ٹوٹ گیا
تیری نرم اور گداز باہوں میں
زیست بے کیفیوں میں ڈوب گئی
نیند سی چھا گئی ہے راہوں میں
کتنے سنگ گراں ہٹا کر بھی
آہ اب سوچتا ہوں میں
زندگی اپنی موت ہے نہ حیات
ساز ارماں کے تار ٹوٹ گئے
موت کی نیند سو گئے نغمات
جو کبھی مہر و مہ سے روشن تھی
غم کی ظلمت میں کھو گئی وہ رات

روح پر چھا گیا ہے سناٹا
منجمد ہو گئے ہیں احساسات
اُف یہ پلکوں پہ ٹمٹاتے دیئے
اف یہ بجھتی ہوئی سی شمع حیات
دیکھتے دیکھتے ہی بیت گئے
جگمگاتے ہوئے حسیں لمحات
پھیلتی جارہی ہے حسرت دل
ڈوبتی جارہی ہے نبض حیات
آنسو و کچھ تمہیں سراغ لگاؤ
مل سکیں کاش وہ حسیں لمحات
تیری چاہت کوئی گناہ نہ تھی
مجھ سے کیوں یہ زمانہ برہم ہے
روشنی تیرگی میں ہے مدغم
آرزو کا چراغ مدھم ہے
مطلع زیست ہے غبار آلود
الجھی الجھی ہوئی ہے راہ حیات
موت پر دل نہیں ہے آمادہ
زندگی کی امید بھی کم ہے
عشرت زندگی کہاں ہے تو
میں کہاں ہوں یہ کیسا عالم ہے

-------O-------

ابنِ آدم کا مقسوم

شب تار وحشت فشاں بڑھ رہی ہے
شب تار جس کے جلو میں کوئی انجم ضوفشاں ماہ تاباں نہیں ہے
زماں و مکاں ظلمتوں کے مہیبانہ یلغار میں بے نشاں ہو رہے ہیں
کراں تا کراں آسمان و زمیں تیرگی کے تموّج میں کھوئے ہوئے ہیں
ہوا کی ہر اک موج شاخوں سے پیہم لپٹتی ہوئی سسکیاں لے رہی ہے

فضائے در و بام پر طائرِ پر شکستہ کی مانند خاموشیاں ہانپتی ہیں
کوئی رس بھری شوخ چنچل صدا، کوئی آوازِ پا، کوئی مونس بنا بھی نہیں ہے
کوئی شمع رو، کوئی شعلہ بدن، کوئی مہ پارہ تاب آفریں تابش افزا نہیں ہے
یہاں کچھ نہیں چاروں جانب اُبھرتی ہوئی تیرگی کے سوا
کہ جیسے یہی تیرگی ابنِ آدم کا مقسوم ہے کوئی یارا نہیں ہے
کہ جیسے پسِ پردہ ظلمت شب ابھرتا ہوا کوئی زریں سویرا نہیں ہے
یہی عالم دل یہی کچھ سماں ہے
اُبھرتی ہوئی یاس کی تیرگی غم کی بھیانک فضاؤں میں وحشت فشاں ہے
ہر اک سمت خاکسترِ آرزو جل بجھی حسرتوں کا دھواں ہے
کوئی شمعِ امید ماہ تمنا آرزو کا ستارا نہیں ہے
یہاں کچھ نہیں یاس کی تیرگی کے سوا
یہی عالم دل یہی کچھ سماں ہے، مگر دل کہاں ہے؟
خلش ہے، تپش ہے، ابھرتی ہوئی ٹیس ہے، درد ہے
گرفتہ دلی ہے الجھتی ہوئی سسکیاں ہیں فغاں ہے
تڑپتی ہوئی آرزوؤں، شکستہ اُمیدوں کا اک کارواں ہے
گراں بار محرومیاں موج در موج اُمنڈتی ہوئی سسکیاں بن رہی ہیں
تمنائیں ہیں طائرِ پر شکستہ جو موجِ نفس کے لئے ہانپتی ہیں
یہاں کچھ نہیں یاس کی تیرگی کے علاوہ
جہاں گھور اندھیروں میں کھویا ہوا ہے ہر اک نقشِ ہستی
کہ جیسے یہ نگری ہو شہرِ خموشاں
جسے ظلمتِ شام افتادگی نے اندھیروں کے طوفاں میں گم کر دیا ہو
یہاں کچھ نہیں ہے گھٹا ٹوپ اندھیروں ابھرتی ہوئی ظلمتوں کے علاوہ
کہ جیسے ابد تک اندھیرا نصیب دلِ زار ہو گا سویرا نہ ہو گا
اُمنڈتے ہیں آنکھوں میں رہ رہ کے آنسو
وہ آنسو جنھیں پونچھنے کو کسی کا مہکتا ہوا نرم آنچل نہیں ہے
کوئی دامنِ مہر ساماں نہیں ہے
فقط دامنِ مہربان زمیں ہے
مگر کون اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں سے کہے اب
کہ آنسو تو اُفتادگی کے پیامی ہیں پیغامِ صبحِ درخشاں نہیں ہیں
دلِ زار اشکوں سے کیا فائدہ ہے

شبِ تار اشکوں سے روشن نہ ہوگی

-------O-------

تم مگر نہیں آئے

موسم بہاراں میں
رنگ و بو کے طوفاں میں
ہر طرف تمہیں ڈھونڈھا
مجمعِ حسیناں میں
تم مگر نہیں آئے

رنگ رنگ پھولوں کا
عنبریں بگولوں کا
مستیوں کے جھولوں کا
مخملیں ہیولوں کا
رقص ہے رگِ جاں میں
تم مگر نہیں آئے

رنگ روپ کی دنیا
کونپلوں میں لہرائی
ڈال ڈال پر جھومی
نکہتوں کی برنائی
کتنی تیری یاد آئی
تم مگر نہیں آئے

بدلیاں امڈ آئیں
چھا گئے ہیں دَل بادل
شاخ شاخ جھومی ہے
پتا پتا ہے بے کل
کتنے روپ ہرائے
تم مگر نہیں آئے

ادھ کھلے شگوفوں میں
مدھ بھرے پیالوں میں
چل رہی ہے پروائی
جیسے تو خیالوں میں
من تھا کتنا سودائی
تم مگر نہیں آئے

ہر روش ہر اک جانب
گونجتے رہے نغمے
کتنی ہی کھلیں کلیاں
کتنے پھول مرجھائے
تم مگر نہیں آئے
تم مگر نہیں آئے

-------O-------

قیدی

سر کہسار سروِ آزاد خودرو سبزہ کی جھرمٹ میں
کیف زندگی سے جھوم اٹھے ہیں
یہی کہسار کی وادی
چٹانوں سے گھرے زندانیوں کی کہنہ مسکن ہے
سکوت شب میں آوازیں
ہوا کے دوش پر آزاد طائر
کی طرح اڑ کر بلندی تک پہنچتی ہیں
وہ آوازیں جو زنداں سے نکل کر
چاروں جانب پھیل جاتی ہیں
تو کُتے بھونکتے ہیں، افعیوں کی تند پھونکاریں لپکتی ہیں
درِ زنداں کو توڑو قیدیو
زندان آب و گل نہیں

زندان سنگ و خشت و آہن
توڑ کر مثل ہوا آزاد ہو جاؤ
جہاں بھی سانپ، کتے، بھیڑیئے، افعی محافظ ہوں
بپھر کر تند طوفانی تھپیڑوں، تیز یلغاروں
سے پتھر کی فصیلیں سرنگوں کر دو
یہ سرو آزاد ہیں ان کی جڑوں میں سنگ پارے
خود مقید ہیں

-------O-------

دیمک زدہ خط

آج صندوق کہنہ جو کھولا ملا
ایک خط جیسے دل کا پھپھولا جلا
یاد کی دھیمی دھیمی ہوائیں چلیں
رفتہ رفتہ عجب آندھیاں چل پڑیں
ڈھکنا تھامے ہوئے گم خیالوں میں ہوں
ایک دیمک زدہ خط کا اب کیا کروں
پھر بھی ہر لفظ ہے ایک رستہ کھلا
آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا
مجھ کو لکھ لکھ کے خط جو بلاتی رہی
آج پہچان میں بھی نہ آئے مجھے
سامنے سے گزر جائے تو ہو خیال
میں نے پہلے کہیں اس کو دیکھا تو ہے
ذہن چلتا رہے، ذہن چلتا رہے
پچھلی یادوں کی ریلیں چلاتے ہوئے
پھر بھی یاد آئے کچھ بھی نہ اس کے سوا
یہ حسیں چہرہ میرا ہے دیکھا ہوا

-------O-------

شعور

میں جنہیں بھولا وہ آئے خواب میں
اور میں حیراں کہ یہ شکلیں کہاں سے آ گئیں
کون سا وہ غار ہے جس میں حسینائیں ہیں بند
بے خودی میں ان ستاروں پر میں کیسے ڈال دیتا ہوں کمند
کونسا وہ دیو ہے
جس کے فسوں میں ہیں حسیں
کون سے غاروں، ستاروں میں چھپاتا ہے انہیں
کیسے خوابی آسمانوں میں پھراتا ہے انہیں
کیسے افسونی جزیروں میں ملاتا ہے انہیں
وہ جزیرے جو ابھر آتے ہیں بحر خواب میں
خود مجھے اس دیو کی صورت نظر آتی نہیں
اور جب بھی جوش میں آتا ہے، وہ یہ صورتیں
یک بہ یک مجھ کو دکھاتا ہے کہ اب آگے بڑھو
ان کو لو آغوش میں لب پر دو بوسے وجد میں
بھینچ لو اس زور سے ان کو کہ رس بہنے لگے
میں یہ کہتا ہوں کہ دم تو مجھ کو لینے دے ذرا
سوچنے دے ان کو دیکھا تھا کہاں
میں نے کب چاہا تھا ان لذت بھرے اجسام کو
کچھ تو مجھ کو یاد کر لینے دے ان ایام کو
جب میں ان کی خواہشوں کی آگ میں جلتا رہا
میں معزز ہوں مجھے رس راگ سے ہے دشمنی
کچھ تو مجھ کو تیز کرنے دے خرد کی روشنی
تاکہ مدھم رنگ رنگی قمقموں کے رنگ میں
عیب مخفی رہ نہ جائیں دیکھ پاؤں میں انہیں
دیو میری سمت تکتا ہے لگا کر قہقہے
قہقہے، جن سے لرز جائے کہستانِ وجود
میں لپٹ جاتا ہوں گھبرا کر دوشیزاؤں کے ساتھ
کتنی دیکھی اور ان دیکھی حسیناؤں کے ساتھ
اور یوں اس دیو کے تھمتے چلے جاتے ہیں

سنگین قہقہے
دور جیسے گونجتی ہوں کتنی توپیں جا بہ جا
دور سے آتی ہو جیسے پھٹتے گولوں کی صدا
میں بڑھاتا ہوں صدائے بوسۂ لب زور سے
ساتھ ہی یہ سوچتا ہوں ان کو دیکھا تھا کہاں
سوچتا ہوں، سوچتا ہوں، سوچتا ہوں، بار بار
اور چھٹتی ہی نہیں ماضی کی دھند
پھر یہ چھٹتی ہے تو ہر نادیدنی ہے دیدنی
گفتنی ناگفتنی

-------O-------

منزل

سوچ لے جان حیات
کئی صدیوں کے بہیمانہ روایات کے جال
توڑ سکتے ہیں ترے پھول سے ہاتھ
تو کہ شاداب پہاڑوں سے ہے بڑھ کر شاداب
اور کلیوں کی طرح نرم و گداز
نشترِ غم کی چبھن سے تو نہیں تڑپو گی
ناامیدی کی سم آلود فضاؤں کا غبار
تیرے دل پر تو نہیں بیٹھے گا
دیکھتے دیکھتے مرجھا تو نہیں جائے گی تو
سوچ لے جان حیات
ہر قدم راہ میں پھیلائے ہوئے خاروں کو
دیکھ کر تیرے قدم رک تو نہیں جائیں گے؟
نقرہ و زر کی حسیں جھنکاروں سے
بے نیازانہ گذر جائے گی تو؟
اور مرے ساتھ محبت کے سنہرے نغمے
آ سکے گی مری جان ڈر تو نہیں جائے گی تو؟
سوچ لے راہ ہے مشکل کتنی
تیرا نازک سا بدن

دے نہیں سکتا ہے مصائب کے تھپیڑوں کا جواب
سوچ لے جان حیات
آہنی عزم کے ساتھ
دے مرے ہاتھ میں ہاتھ
چلیں منزل کی طرف
اپنی منزل کی طرف

-------O-------

نجومی سے......

مری تقدیر میں کیا ہے
یہ مانا تم بتا دو گے
مگر تقدیر خود کیا ہے
کبھی تو نے یہ سوچا ہے؟
ترا اپنا ہے کیا انجام
اور آغاز کیونکر تھا
ترے بچپن کے وہ ساتھی
جو تجھ سے اتنے آگے ہیں
کہ ان کی گردِ پا تک کہکشاں ہے تیری نظروں میں
جو محلوں، کارخانوں، کوٹھیوں
کے جال بُن کر آج تجھ سے ناشناسا ہیں
اس انسانوں کے جنگل میں کبھی سوچا ہے وہ کیا ہیں
وہ ان کے آسماں بوس آستانے
کون سے افسوں سے بنتے ہیں
لکیریں دیکھتے ہو ہاتھ کی وہ ہاتھ بھی دیکھے
جو پراسرار دیواروں کے پیچھے حدفاصل کے نگہباں ہیں
وہ حد جو آدمی اور آدمی کے درمیاں
ناقابل تسخیر بنتی ہے
خط تقدیر بنتی ہے
اس تقدیر میں کیا ہے یہ مانا تم بتا دو گے.........

-------O-------

سانولی سی بھولی سی

وہ جو ایک لڑکی ہے
سانولی سی بھولی سی
جس کے واسطے اک دن
باوجود معصومی
جان کا جوا کھیلا
اس نے چھب دکھا کر آج
بے خبر سی بن بن کر
ایک بس دکھائی ہے
اک عجیب منزل کی
اک عجیب زنداں کی
اک عجیب مقتل کی
جانے اس کی منزل ہے
یا وہ میری منزل ہے
عشق جرم ہے میرا
غم وہی ہے جام ہوگا
ذہن میں ابھرتا ہے
بار بار نام اس کا

-------O-------

بولتی ہوئی آنکھیں

ہرنیوں کی مست آنکھیں
بولتی ہوئی آنکھیں
بولتی ہیں کیا کیا کچھ
پھر بھی میں نہیں سنتا
پھر بھی کچھ نہیں کہتا

بولتی ہوئی آنکھیں
کہہ رہی ہیں کیا کیا کچھ
جسم کا اٹل رشتہ
جسم کی اٹل آواز
جسم و جان کا رشتہ
خواہشات کی پرواز
ڈھلتی ہے نگاہوں میں
بولتی ہیں پھر آنکھیں
بولتی ہیں کیا کیا کچھ
پھر بھی میں نہیں سنتا
پھر بھی نہیں کہتا
کتنی سخت زنجیریں
کتنی سخت دیواریں
ٹوٹ کر بکھرتی ہیں
ذہن کے حصاروں سے
چھن کے ان کی آوازیں
مست مست آنکھوں سے
جھانکتی ہیں ہر جانب
بولتی ہیں پھر آنکھیں
اور میں نہیں سنتا
سوچتا ہوں پھر بولوں
بند کھڑکیاں کھولوں
اور پروں کو پھر تولوں
کیوں نہ زہر ظلمت میں
آب کیمیا گھولوں
ایک ایک ہرنی ہو
ہر اڑان کی زد میں
آرزوئیں پوری ہوں
عشرتوں کی سرحد میں
اور جب گروں تھک کر

قبر ہی کی نیند آئے

-------O-------

رہ نوردِ معتبر

زمیں ہے ایک سیارہ
فلک پر لاکھوں سیّارے
اور اس سے آگے لاکھوں اور سیارے
سراپا نغمگی ہیں، رقص ہیں، رامش گر افلاک ہیں تارے
ثوابت بھی کروڑوں ہیں
جو اپنی روشنی کی چشمکوں سے رقص پرور ہیں
خلا میں کس کے درباں اور ہرکارے ہیں، اب تک بے خبر ہیں ہم
نہ یہ درباں نہ ہرکارے نہ خیالات مجسم ہیں
وجود محض کے رخسار پر قطرات شبنم ہیں
وہ شبنم جو کروڑوں سال میں تحلیل ہو پائے
مگر ہم چند روزہ گریہ آلودہ تبسم ہیں
چلو پھر کیا ہے؟——
کیا یہ بات کچھ کم ہے کہ ہم وقف ترنم ہیں
ہمارا عشق آفاقی ہمارے گیت آفاقی
اور اس آفاقیت کے رہ نورد معتبر ہم ہیں

-------O-------

زمیں ہے ایک سیّارہ

کروڑوں مہر و ماہ و مشتری ناپید و زہرہ ہیں
سبھی اک رقص آفاقی و نغمات جہانی کی پیمبر ہیں
زمیں کے رقص اور نغمے
وہ لہریں ہیں جو حرکات اور آوازوں میں ڈھل کے
آسماں کے بیکراں سینے میں گونجے ہیں

ہم ان نغموں کے پیکر ساز ہستی کی صدائے بیکراں بھی ہیں
ہم اپنا ساز بھی ہیں ساز کی آواز بھی ہیں جاوداں بھی ہیں
زمیں کے ہم پیمبر ہیں
زمیں ہے ایک سیّارہ جہاں سے ابتدا کی تھی
اور ان افلاک کے تاروں سے اپنی ابتدائے نو کریں گے ہم

-------O-------

تو اور میں

یہ کیا ہو گیا ہے !!!
کہ میری صدا خود مرے ہی لئے اجنبی ہے
جو تجھ کو سناؤں تو حیرت میں ڈوبے
ترے بھولپن کا ہر اک جال ٹوٹے
یہ جتنی پرانی ہے اتنی نئی ہے
سنو، ہاں سنو، کیا صدا کہہ رہی ہے
بدن ہی بدن ہے یہ مانو نہ مانو
ترنم فشاں آبشار اک بدن ہے
یہ چاند اور سورج، زمیں اور ستارے
یہ جھیلیں، یہ دریا، یہ ندی، یہ نالے
بدن ہی بدن ہے جو کچھ دیکھتی ہو
یہ سبزہ، یہ پیڑ اور زمیں سب بدن ہیں
ہوس بھی بدن ہے زمیں بھی بدن ہے
رسوم و روایات کی جامہ زیبی
بدن کے مظاہر لباس بدن ہیں
بدن ہی سے وحشت بدن ہی سے راحت
بدن ہی سے طوفان جذبات بھی ہے
یہ پھول اور بھنورے، یہ پنچھی بدن ہیں
ہوا بھی بدن ہے، بدن ہی ہیں سانسیں
چٹکتی ہوئی نرم کلیاں، بدن ہیں
ہواؤں کے دامن میں خوشبو، بدن ہے

ستارے بدن ہیں، زمیں بھی بدن ہے
فضا بھی بدن ہے، خلا بھی بدن ہے
بدن میں بدن کے ستارے رواں ہیں
بدن ہی کی آندھی کا مظہر جنوں ہے
بدن ہی سکوں ہے، بدن ہی فسوں ہے
فنونِ لطیفہ بدن کی صدائیں
مغنی کی تانیں بدن کی پکاریں
بدن کی پکاریں حسیں آبشاریں
گلا گھونٹ دیں بیکراں خواہشوں کا
تو پھر جھوٹ کی سر بلندی رہے گی
تو پھر جھوٹ کی فتح یابی رہے گی
یہ پاکیزگی روح تقدیس سارے فسانے
لباسِ ریا مکر کی خلعتیں ہیں
یہ روح اور روحانیت کا ترانہ
ملمع گری اور بازی گری ہے
بدن ہی خلوص وجود آفریں ہے
وہ مینا اٹھا جام بھر رقص کر
بدن کے ترانوں کا جادو چلے
میں مضراب ہوں بربطِ زندگی کا
دھرا رہ گیا میں تو پھر کیا بنے گا
غلافِ غبارِ زمانہ پڑے گا

-------O-------

وہی رنگ ہے........

سارے ہی موسموں میں وہی رنگ ہے
سردیوں کے ٹھٹھرتے ہوئے دن بھی یوں ہی گئے
وہ افق سے شفق تک کا رہرو یونہی
نیل کے بیکراں شامیانے تلے
شرق تا غرب منزل بناتا رہا

منجمدیخ زدہ پستیوں
کوہساروں، بیابانوں، شہروں میں تابندگی
اور حرارت کے جاں بخش مخزن لٹاتا رہا
ساتھ روزانہ کی جادہ پیمائیاں
طولِ مدت میں پیہم گھٹاتا رہا
شام ہوتی رہی چاند آتا رہا
چاندنی بام و در سقف و میدان میں
عرش سے فرش تک رقص کرتی رہی
بستی بستی میں کھیت اور کھلیان میں
ذرّے ذرّے کے دل میں اترتی رہی
ننگے پیڑ اور پھلواریوں سے ملی
تو ہر اک پیڑ کے ریشہ ورگ میں تھی جھر جھری
پتے گرتے رہے دن گزرتے رہے
ایسے دن بھی کہ جب شامیانے تلے
دونوں تابندہ راہی قریب آ گئے
لیکن اس قرب کا ہر سراب نظر
اک نئی داستان الم کو جنم دے گیا
اور تابندہ راہی بچھڑتے رہے
اپنے محور کی گردش میں جکڑے ہوئے
اپنی ہی حد میں دن رات چلتے گئے
اور دن رات لمحوں میں ڈھلتے رہے
جلتے لمحے جو آندھی میں سگریٹ کے اڑتے دھوئیں
کی طرح سے گئے
اور نادیدہ منزل میں گم ہو گئے
اور یہ نادیدہ منزل مرا ذہن ہے
مرا ذہن ہے یا ترا ذہن ہے
یا یہ نادیدہ منزل کسی اور کا ذہن ہے
اور یہ لمحے جا کر پلٹتے نہیں
یاد بن کر پلٹنے کے اعجاز میں
بیتے دن آنے والے دنوں سے تو ملتے نہیں

خیمہ آسماں کے تلے رہ کے بھی
چاند سورج کے کب مٹ سکے فاصلے
اس قدر فاصلے بھی مٹے ہیں کبھی
ان گنت فاصلے، ان گنت فاصلے
تیری تقدیر ہیں، میری تقدیر ہیں
اور تقدیر کیا ہے؟ یہی بے بسی
بے بسی جو نہ تم سے نہ مجھ سے مٹی
جو کسی اور صورت بھی مٹتی نہیں
ہاں مگر یہ کہ لمحات زر میں ڈھلیں
یا کسی زر کے رتھ زر کے رہوار آنے جانے لگیں
یا اگر انقلاب جہاں تاب میں ڈھل سکیں
تو یہی بے بسی اپنا منہ پیٹ کر
اپنی ہی آگ کی راکھ ہو جائے گی
اور نادیدہ صحراؤں کی بے کراں وسعتوں میں بکھر جائے گی
بے بسی
جس سے بزم جوانی سجائی گئی
بے بسی
جس کے آگے کوئی دن بھی ہو رات ہے
رات کا کیا ہے رات آ گئی اور گئی
اور شب بھر کا جاگا ہوا چاند رخصت ہوا
صبح ہوتی رہی شام ہوتی رہی
کوئی مژدہ نہ پیغام کچھ بھی نہیں
لمحے مرتے رہے
پتے گرتے رہے
اشک امنڈتے رہے
جیسے اپنے ہی ماتم میں روئے کوئی
زندہ مردے کے ماتم میں روئے کوئی
میّت محض کو غم تو ہوتا نہیں
مردہ باد مسرت بھی ڈھوتا نہیں
جب حواس اور احساس کے سارے ہی قافلے جا چکیں

پھر محلات امکان کے دائرے میں تو آتے نہیں
ہاں یہ امکاں فقط زندہ مردہ میں ہیں
یوں میں اپنے ماتم میں روتا رہا
زندگی
اور میں
لمحے لمحے میں ڈھلتے رہے
اور مرتے رہے
پتے گرتے رہے
اشک امنڈتے رہے
پتے پتے کے ماتم میں روتا رہا
لمحے لمحے کے ماتم میں روتا رہا
زندہ ہوتے ہوئے
اپنے ماتم میں روتا رہا
روتے ہی روتے یہ فصل سرما گئی
پھر بہار آ گئی سبزہ و گل لئے
قہقہے، چہچہے، زمزمے جاگ اٹھے
پنچھیوں کے ترانے ابھرنے لگے
نیلگوں آسماں بادلوں سے بھرا
اور بھرتا رہا
موتیوں سی پھواریں برستی رہیں
اور جل تھل زمیں
کچی چاندی کی چادر سی بنتی رہی
کچی چاندی کے گھنگھرو سے بجتے رہے
اور بکھرتے رہے
آسماں پر افق تا افق
کتنے ہی رنگ جادو جگاتے رہے
ابر پاروں کی ٹھنڈی حسیں چھاؤں میں
طائر اڑتے رہے
گیت خوشبو، حسیں رنگ، ہر سو، ابھرتے رہے
اور سر سبز پیڑوں کے ہی درمیاں

اک نہ اک پیڑ، گم گشتہ پتوں کا نوحہ سناتا رہا
جس کی ایک شاخ
ایک اوننے سی موج ہوا سے لرزتی رہی
چند ایک خشک پتوں کو تھامے ہوئے
لمحے لمحے جو دامن چھڑاتے رہے
لے اڑی جن کو موج ہوا
اور پیڑ اس خجالت میں
عریانیت میں سسکتا رہا
سسکیاں
اس کی شاخوں میں تھیں
یا ہوا میں تھیں
کس کو خبر
میں تو روتا رہا
شام ہوتی رہی
صبح ہوتی رہی
وقت اڑتا رہا
اور پیغام کوئی نہیں
کچھ نہیں!!
بیتے لمحوں کی یادیں بھی دھندلا گئیں
اڑتے پتوں کے منظر بھی گم ہو گئے
پتھروں پر کہیں سر دھرے سو گئے
اور اب
جب کہ گرمی کے سورج میں تابش بھی ہے
صبح کے وقت کی کیف پرور
سنہری چمکتی ہوئی دھوپ میں
فصل کاٹی کوئی اور نہ بوئی کوئی
لیکن اس فصل میں بھی
کونپلوں مہکتی پھلواریوں
اور شفق تو فقط رنگ ہی رنگ ہے
رنگ امید کے خون کا.....پھول کا

لیکن اک مژدۂ انقلاب آفریں
پھول میں بھی، شفق میں بھی، پوشیدہ ہے
سارے ہی موسموں میں وہی رنگ ہے
-------O-------

شعبدہ بازوں سے

آسماں نیلا ہے لیکن زرد ہی کہتے رہو
اور زمیں کو کہہ کے عکسِ آسماں نیلی کہو
دق سے جو اجسام ہوں تحلیل انہیں نازک کہو
تذکرہ ان کی لطافت اور نزاکت کا کرو
کہہ دو سمیت دقی خمار افزا بہت
لطف کا دریا بہت
بجھتے چہروں کو جو پاؤ سخت مٹیالے کہو
رنگ کی دنیا میں ہے یہ رنگ سب سے لاجواب
ان کے مٹتے نقش جو دیکھو انہیں دلکش کہو
اور ٹھہراؤ مصور کے حسین خوابوں کے روپ
دیویوں کا ہی سروپ
آڑی ترچھی کچھ لکیریں کھینچ کر رنگیں کرو
رنگ کے بھی یوں ہی کچھ چھینٹے سے دو قرطاس پر
اور کہو ہے دردِ انسانی کا تجریدی نمود
ہے بشکلِ رنگ و قوس و خط فقط غم کا سرور
مفلسی کے سیل میں بہتی ہوئی خاشاکِ زیست
جس جگہ دیکھو کہو سحر ہم آغوشی ہے یہ
خود فراموشی ہے یہ
میں نے ایسے جسم بھی دیکھے جو چٹخے تھے تمام
زلزلوں کے زور سے جیسے چٹختی ہے زمیں
بادِ افرنگی سے پھٹ کر جو ہوئے تھے لاعلاج
موت منڈلاتی کہ کل لے جائے ان کو یا کہ آج
تم کو کیا، کیا ہے سماج
تم نے دیکھا ہو تو ان کو منجمد آتش کہو

پاگل گرمی کہو رنگینی خواہش کہو
رنگ کی بارش کہو
بات کیا ہے، کس کا ڈر ہے، شعبدہ بازو تمہیں
ڈر حقائق سے ہے، کہ ظالم سے، کہ اپنے آپ سے
منظرِ غم اور صدائے درد سے چھپتے ہو کیوں
نیچے کیوں آتے نہیں ہو اپنے قصرِ خواب سے

-------O-------

میں کون ہوں؟

میں کون ہوں
میرے لاکھوں ہی نام
لاکھوں مظہر
وجودِ کا بحرِ بیکراں ہوں
کروڑوں برسوں کے ارتقا کی بھی داستاں ہوں
مری صدا میں تری صدا ہے
کدھر صدا میں
وجود تابندہ جاوداں کی ہے نغمہ ریزی
ہر ایک "میں" ایک حسیں اشارا
جو حسن آواز بن رہا ہے
یہ سب اشارے
جو ایک "میں" سے ابھر رہے ہیں
وجود کے بیکراں دیئے تہ بسیط جوہر
عمیق باطن کے بحر کی سطح کے کنول ہیں
جدا جدا بھی ہیں ساتھ بھی ہیں
ابھر رہے ہیں، بکھر رہے ہیں
بکھر رہے ہیں، ابھر رہے ہیں
جو مر رہا ہے وہ زندگی کے نئے مظاہر میں ڈھل رہا ہے
عظیم ذرّوں کا ارتقائی شعور بھی
شانِ ممکنات وجود کا ایک رخ رہا ہے
میں جانتا ہوں

کہ زندگی کی صلیب پر ایک ایک لمحہ
مرے تنفس میں رچ کے مصلوب ہو رہا ہے
مرے بدن کا ہر ایک ریشہ
ہر ایک ذرّہ
پیالہ حرف ناموافق کے سم سے مسموم ہو رہا ہے
وہ کون تھا؟
جس نے زہر کا پیالہ جام مے کی طرح پیا تھا
وہ کون تھا
جو صلیب پر آفتاب تاباں بنا ہوا تھا
جو بادلوں کے عمیق سایوں میں
بادو باراں میں
آسماں وفا پہ تابندہ تر ہوا تھا
وہ کون تھا؟
جس نے گھر لٹایا
تمام کنبے کی گردنیں دیں
اور اپنا سر دے کے جاودانی حیات کا راستہ دکھایا
وہ بے بسی کے سلاسل آہنی میں جکڑا
وہ کون تھا کوہ قاف کی اک بلند چوٹی پر سر جھکائے
جو آج آزاد ہو گیا ہے
جو رنگ رنگی سراب کی تابشوں سے بچ کر
نشان منزل کو ڈھونڈھتا ہے
نشان منزل جو ارتقا کی اٹل کڑی ہے
اگرچہ سر راہ اژدھوں کی
مہیب پھونکار سے بھری ہے
فضائیں عنبر نشاں نہیں ہیں
مگر ہر اک ذرّہ عنبریں ہے
سیاہیوں کے بھنور ہیں ہر سو
کئی حسیں اور کئی حسینائیں
ناگ ناگن ہیں
جن کی پھونکاریں سن رہا ہوں

عمیق اندھیرا

تمام اطراف سے اُمڈ کر
مجھے بھنور میں ڈبو رہا ہے
میں مر رہا ہوں
مگر نئی زندگی کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں
وہ سانچے جو سرخ سرخ شعلوں
ابھرتی پُرتاب زرد کرنوں سے عالم نو بنا رہے ہیں

-------O-------

سراب

سڑک پر جگمگاتی دھوپ
کرنیں جیسے آئینہ پہ پڑتی ہوں
حسیناؤں کے لہراتے ہوئے آنچل
ہزاروں بادبانی کشتیوں
کے بادبانوں کی طرح
انبوہ در انبوہ انسانوں
کے دریا میں ابھرتے ہیں
نہ یہ دریا نہ وہ رستہ
نہ کوئی بادبانی کشتیوں کی بحر پیمائی
ہوا سے جھولتے اشجار
سورج کی تمازت
کے مقابل میں تھرکتے ہیں
ہزاروں لوگ ایسے بھی ہیں
جو ہر سو بھٹکتے ہیں
میں خود مدت کا اک بھٹکا ہوا راہی
ہر اک آواز، ہر آہٹ، ہر اک رنگیں اشارے پر
بصارت اور سماعت کے سرابوں میں
ہزاروں رنگ بھرتا ہوں
یگانے اور بیگانے

سبھی اک وحدت کرب آفریں ہیں اب
یہ کیا جھنکار ہے
پازیب کی ہے؟
جام ٹوٹا ہے کہ کوئی ساز ٹوٹا ہے؟
نہیں!! للکار ہے؟ للکار کیسی ہے؟
کسی ساحر کی
شیشوں کی دکاں میں
زور سے للکار گونجی ہے
اگر شیشے ہماری قامت و قد کے فسوں کا راز
آرائش کدوں میں عام کر ڈالیں
تو پھر ظاہر تو کیا
باطن کی بھیانک بدنمائی
عام انسانوں پہ آخر فاش ہو کر
نظم ہستی کو مٹا دے گی
ذرا چمکاؤ آئینے
کہ عکس رخ
کسی صورت سے بہتر ان میں آجائے
نہیں تو توڑ دو شیشے
اور اپنے آپ کو حسن جہاں کا ترجماں سمجھو
حقیقت کا جہاں سمجھو
کہ آئین جمال
آرائش رخسار و گیسو و کمر تک ہے
نظر تک ہے
ہر اک آئینہ حیراں ہے
کہ سنگ وحشت و آہن کا یہ ایوان ہے
کئی ہیں سنگ بر کف اور قصر زر گری میں ایک طوفاں ہے
اور اس کے ساتھ ہی
اس قصر کے باہر
کروڑوں چیختے چلاتے انسانوں میں ہیجاں ہے
کہاں سے کس طرف کو سنگ جائے گا

زمانہ منتظر سا ہے
مگر کیا یہ سماعت اور بصارت کا سراب معتبر سا ہے
اڑتے اڑتے میری عینک گر پڑی
اور زمیں پر آگ یا بہر تلاش
اگتی فصلیں دیکھ کر آیا خیال
کس طرح حاصل کروں اپنی معاش
ایک پگڈنڈی نظر آئی تو اس پر چل پڑا
چلتے چلتے چند لڑکے مل گئے ہنستے ہوئے
میں نے ان سے راہ پوچھی تو اٹھا کر انگلیاں
اک مسقف ساختماں کی سمت اشارا کر دیا
میں نے سوچا یہ کوئی رستہ نہیں
شہر تو ہے کوئی مدخل تک نظر آتا نہیں
یونہی چند اک سیڑھیاں طے کیں تو دالان آ گیا
پھر یہ دیکھا چشم حیرت نے درون شہر ہوں
اجنبی چہروں کو تکتا تھا کوئی ملتا نہ تھا
شہر کے ایک ایک رستے پر چلا، چلتا گیا
اک چھتی وادی، فصلیں اس کی، اس کے ہی پہاڑ
جیسے مل کر کتنے میلوں میں ہوں پُل پھیلے ہوئے
نیچے خالی اور اوپر تھے گھروں کے سلسلے
اجنبی لوگ، اجنبی ماحول، خونی قہقہے
میں انہیں تکتا رہا، بڑھتا رہا
راستہ چلتا رہا، چلتا رہا
چند اک یوں ہی تجسس میں مرے ساتھ آ گئے
کچھ سنایا، کچھ سنا، کچھ جی میں غوطہ کھا گئے
عورتیں گزریں مگر بیگانہ وار
مرد بھی آئے نظر دیوانہ وار
جن کی آنکھیں آگ کی سی ڈوریوں کا جال تھیں
جن کے چہروں پر کھچاؤ کا عجب انداز تھا
ریشہ ریشہ ایسا جیسے تار کھینچیں ساز کا
سب کی سب ایسی ہی شکلیں جیسے دیکھی ہوں کہیں

لیکن اس صورت سے بدلی تھیں کہ یاد آتی نہ تھیں
جو چلے تھے ساتھ، اچانک رک کے یہ کہنے لگے
دیکھئے دو عورتیں جو پاس سے گزریں ابھی
دیکھئے تو غور سے وہ آپ کی ماں جائی تھیں
میں نے آگے بڑھ کے دیکھا تو نہ پہچانا انہیں
بے مروت اجنبی نظروں سے تک کر بڑھ گئیں
میں انہیں حیرت سے تکتا ہی رہا؟
سخت سردی تھی مگر ملبوس میرا سرد تھا
ان کے ملبوسات عالی میں پیام درد تھا
درد جو کہتا تھا دیکھو فرق کتنا ہم میں ہے
ایک ہی سیپی کے موتی ایک پھلواری کے پھول
ان کی قسمت میں ہے آسائش، تیری قسمت میں ہے دھول
وہ نگاہوں سے ہوئیں اوجھل تو اک پیر کہن
کچھ خمیدہ پشت لیکن گرم پوش و سخت کوش
پاس آیا اور آگے بڑھ گیا تکتے ہوئے
اس کی آنکھوں میں ذرا سی روشنی
ایک لمحے کے لئے آ کر نمی میں ڈھل گئی
اک تجسس کوش نے دیکھا مری جانب کہا
آپ نے جانا انہیں؟
کیا نہ پہچانا انہیں؟
آپ کا فانوس ہستی ان سے ہی روشن ہوا
میں نے بے تابانہ دیکھا جانب مرد کہن
آگے دوڑا اور ملا لیکن وہ مرد اجنبی
معذرت خواہانہ آگے بڑھ گیا رکتے ہوئے
میں نے گھبرا کر پھر اپنی راہ لی چلتے ہوئے
اور تجسس خواہ میرے ساتھ ہی چلنے لگے
کوئی رخصت ہو گیا تو اور کوئی آ گیا
مجھ سے پوچھا میری منزل ہے کہاں
تشنہ بھی تھا، گرسنہ بھی اور منزل بھی نہ تھی
میں نے بوجھل دل کے ساتھ اس کو کہا

میری منزل ہے تلاش آدمی
آدمی، جو ظلم سے اور اجنبیت سے ہوں مصروف جہاد
آدمی، جو سرد مہری سے نہ ماریں آدمی
چپ رہا وہ، پھر نظر میں آ گئیں چند اک قبور
جو دکھائی دیں قریب اور آگے بڑھنے پر تھیں دُور
دیکھے عم و عمّہ کے سنگ لحد
دو نوں انساں مہرباں تھے جن دنوں زندوں میں تھے
ان میں اک تھا فلسفی اور دوسری آزاد خُو
جو کبھی بحرِ محبت تھے مگر اب خشک جُو
جن کو ڈھیروں سنگ و خاک و خشت تھے ڈھانپے ہوئے
ایک مرقد میں وہ تھی بخشا مجھے جس نے وجود
وہ سراپا مہر و ایثار اک محبت کیش ماں
خاک کے پردے میں تھی آسودۂ خواب ابد
مجھ سا کافر فاتحہ پڑھتا تو کیا پڑھتا وہاں
شبنمی موتی لٹائے اور آگے بڑھ گیا
اور یونہی چلتا رہا
پھر اچانک ایک بھاری جسم کی عورت ملی
دیکھ کر مجھ کو وہ ٹھٹھکی ایک لمحے کے لئے
اس کے دونوں سمت دو ننھے فرشتے بھی رکے
دوسرے لمحے میں لیکن سب کے سب آگے بڑھے
اک تجسس کوش نے میری طرف دیکھا، کہا
''محترم خاتون کو کیا اب بھی پہچانا نہیں؟
اور یہ شمعیں جو ہیں ان کے دائیں بائیں ہاتھ میں
آپ ہی کے دم سے یہ روشن ہوئی ہیں دھر میں''
میں بڑھا آگے مگر وہ چہرے بیگانہ رہے
محترم خاتون کی آنکھوں سے دو چشمے بہے
میں نے دکھ پوچھا تو وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی
میں نے چلّا کر کہا کیا حافظہ گم ہے مرا؟
اور اگر ایسا ہی ہے تم کس لئے خاموش ہو؟
اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا ہونٹ میں جنبش ہوئی

چپ نہ ٹوٹا اس کا پھر بھی، رخ کو پھیرا اور گئی
اور میں تکتا گیا، تکتا گیا
وہ نظر سے ہو گئی اوجھل تو گزرے چند لوگ
یہ بہت عجلت میں تھے اور اجنبی سے لوگ تھے
اک تجسس کوش نے پھر مجھ کو دیکھا اور کہا
آپ نے ان کو بھی پہچانا نہیں؟
میں نے بڑھ کر پھر انہیں دیکھا تو سب خاموش تھے
دوسرے ناآشناؤں سے بھی بڑھ کر سرد تھے
ان کو مایوسی سے دیکھا اور کہا یہ کون ہیں؟
میں نے پہچانا نہیں
واقعی جانا نہیں
میں بہت گھبرا گیا، سوچا یہ کیسا شہر ہے
میں کہاں سے آگیا ہوں؟ مجھ کو جانا ہے کہاں
ذرّہ ذرّہ کیوں پراسرار اور اتنا سرد ہے
پھر بہت سے لڑکیاں ایک ایک دو دو چار چار
پاس سے گزریں نگاہیں پھینکتی، ہنستی ہوئی
ان کی نظروں میں ہوس ہی تھی، محبت تھی نہ لطف
سخت پراسرار، اس پر سخت اشارے پے بہ پے
اور چپ اتنی کہ جیسے موت ہو ان کے لئے
کوئی بھی آغاز کلام جیسے کوئی حملہ آور فوج ہو
اور مجھ کو ایسا قلعہ دار سمجھی ہوں جو حامی ان کا ہو
جو اشارہ پا کے دروازہ کو کھولے تو کریں سر یہ حصار
ان کی آنکھوں میں تھا عیاری کی تابانی لئے مبہم پیار
لیکن ایسا جو کسی پرفن شکاری ہی کی آنکھوں میں ابھرتا ہے
جب آتا ہے شکار
ان میں کچھ ایسی بھی تھیں
جو چاہتی تھیں
خود ہی آجائے شکار
اور بڑھے دیوانہ وار
جن کی آنکھیں تھیں عمیق اور رخ عمق میں تھے سوا

جن کے ہر روشن تبسم میں نہاں تھے لاکھوں رنگ
تہ بہ تہ جذبات ہیں بازی گری کے ڈھنگ بھی
جن کے گیسوان کی پیچیدہ طبعیت کی حسیں تصویر تھے
جن کی زلفوں میں سلاسل اور شب کا میل تھا
جن کی نظروں میں محب آدمیت کا نشیمن جیل تھا
پیار کی چالوں میں حرماں کاری و مردافگنی
اس پہ یہ اصرار تاریکی میں دیکھو روشنی
میں نے سوچا پیار کے یہ کون سے اقسام ہیں
اور عداوت کے یہ کیسے دلنشیں سے دام ہیں
جن کا مقصد ہے کہ جاں کو نذر بے تابی کروں
اور حرمانِ مسلسل کی فضاؤں میں مروں
پھر خیال آیا کہ شاید واہمہ ہو یہ مرا
ان سے مل لوں اور توّاہم کے مٹاؤں سلسلے
شاید ان کے دل سے میرا زخم خوردہ دل ملے
میں نے ان سے گفتگو کی تو تبسم بھی گئے
اور آنکھوں سے وہ تابانی کے انجم بھی گئے
یوں ہوا محسوس جیسے ان کو ہے ہسٹیریا
ایک لمحہ پیشتر اپنائیت کا دورہ تھا
دوسرے لمحے میں بیگانہ روی کا ہے جنوں
یا کسی نے ان پہ پھونکا ہے کوئی سحر و فسوں
میں نے سوچا ان سے تو بہتر ہیں خاکی مورتیں
جو کم از کم ایک ہی انداز میں رہتی تو ہیں
ان کو ان کے حال پر چھوڑا اور آگے بڑھ گیا
پھر ملیں کچھ ایسی، جیسی ہوں مجسم لذتیں
ان کی آنکھوں میں مگر خواہش کی ٹھنڈی لہر تھی
جھرجھری سی آ گئی
میں نے سوچا میں کوئی یوسف نہیں
میں بخارا کا ہوں سوداگر نہ بلخ و شام کا
یا زبان عصر حاضر میں کسی پتلی جزیرے کا رئیس
شیخ یا فرماں روا تو میں نہیں

کچھ کہا ان سے تو وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئیں
چھٹ چکے تھے سب مجسس کوش پھر آیا کوئی
دردمندانہ تمسخر میں سخن پیرا ہوا
زیست صحرا ہے اگر رومان کے گلشن نہ ہوں
ساری رنگینی انہیں پھولوں کی رنگینی سے ہے
اور خوش بینی سے ہے
کیا کسی کو آپ اپنانے پہ آمادہ نہیں
کیا کسی کے ہو کے بھی رہنے کے کچھ قائل نہیں
بات کیا ہے کیوں کسی کی سمت بھی مائل نہیں
ہے کوئی ضعف بدن؟ یا ضعف اعصاب و غدود
کیا ہوا؟ کیا دے گئے ہیں ہاتھ پاؤں ہی جواب
کس لئے ہوتا نہیں؟
لذت اجسام کے چشموں پہ پیاسے کا ورود
میں نے اس سے یہ کہا زہریلے چشمے کیا کروں
پیاس تو ہے کیا بجھا کر خون تھوکوں اور مروں
بہرِ رفع تشنگی یہ چشمہ شیریں نہیں
اور زخم خار دینے پر ہیں مائل سارے پھول
یہ سنا اور وہ مجسس کوش آگے بڑھ گیا
میں بہت ہی مضطرب تھا، بھوک تھی اور پیاس بھی
آخرش دو ایک چہرے آشنا سے مل گئے
وہ رکے، مجھ سے کہا وہ دوست تھے میرے کبھی
میں نے سوچا غم کا کچھ وقتی مداوا ہی سہی
چند لمحوں کے لئے بھولوں غم لیل و نہار
مل گئے ہیں وہ کہ جن کا میں کبھی تھا غم گسار
لیکن ان پر پھر سے طاری ہو گیا بیگانہ پن
جیسے دم بھر میں اجڑ جائے کوئی رنگیں چمن
اور پل میں لُو میں ڈھل جائے کوئی باد بہار
اجنبی سے مہربانوں نے دیئے دو ایک نوٹ
میں نے پھینکا تو کہا احباب تھے وہ جب مرے
ان کی جانب تب نکلتا تھا یہ تھوڑا سا حساب

زور ڈالا ذہن پر، کچھ یاد آیا کچھ نہیں
اجنبی پیاروں نے پھر نوٹوں کو میری جیب میں ڈالا، کہا
چلئے اسٹیشن، چڑھائیں آپ کو گاڑی پہ ہم
میں نے چاہا چیخ کر ان سے کہوں
بھوک بھی ہے، پیاس بھی ہے
اور ہے فکر معاش
میں کہاں جاؤں، کسے دیکھوں، کروں کس کو تلاش
وہ مگر گم سم رہے
اجنبی نظروں سے دیکھا اور کہا آئیں چلیں
یہ فسوں کا شہر ہے یہ آپ کے قابل نہیں
بے محبت، بے مروت، بے حمیت شہر ہے
اس کا پانی زہر ہے
دوسرے شہروں میں شاید بخت کچھ یاور بنے

-------O-------

جاسوس

سرِ شاخ گل ایک بلبل کو جس کے حیات آفریں زمزمے گونجتے تھے
بہاروں کے موسم میں دن کے اجالے میں اک کالے افعی نے یوں ڈس لیا تھا
کہ سارے چمن کی فضاؤں میں وحشت کی پرچھائیاں ہر طرف چھا گئی تھیں
اگرچہ اس افعی کا ایک ایک تارِ بدن طائروں نے فضا میں اچھالا
مگر بعد میں سب کے سب سہم کر اپنی منقار کو زیرِ پر کر کے غفلت میں ڈوبے
نہ دیکھا نہ بھالا کہ کچھ اور موذی ابھی گلبنوں میں چھپے تو نہیں ہیں
یہ عالم رہا تو بہت دور سے ایک طائر نے پیہم یہ نغمہ سنایا
کہ اے طائرو اپنے اپنے نشیمن کی فکروں میں گم ہو کبھی یہ بھی سوچا
وہ کن موذیوں کا تھا ہمدم اسے اور کن موذیوں کی حمایت ملی تھی
وہ کن کے نفس کا تسمم تھا جس سے گلستان کے گل بوٹے مسموم سے ہیں
جنھوں نے اسے ڈس لیا تھا چمن جس کے دم سے گلستان رخت نشاں تھا

وہ جس کا لہو بھی گلستاں کے ہر گل میں رنگ آفرینی میں مشغول ہے
وہ عظمت کا بلبل کہ جس کے ترانوں سے گلشن میں پیہم
وہ معصوم طائر جسے تھی چمن کے ہر اک ذرّے سے والہانہ محبت
جسے اس گلستان کی ہر شاخ گل سے وہی نسبتیں تھیں جو ہیں جسم و جاں
میں
اگرچہ جس افعی نے اس کو ڈسا تھا وہ خود نغمۂ نیستی بن گیا تھا
مگر یہ بھی ڈھونڈھا کہ کچھ اور موذی کہیں گلبنوں میں چھپے تو نہیں ہیں
سراغ ان چھپے موذیوں کا نکالو کہ ان کی گزند آفرینی فنا ہو
کسی نے توجہ نہ کی اور ان کو یہی نغمہ پیہم سناتا رہا وہ
یہاں تک کہ کچھ طائروں نے توجہ تو کی لیکن اپنی کہی ایک ایک نے
کہا یہ چکوروں نے ہم کو تو بس چاند ہی کی طرف اڑتے رہنا ہے ہر شب
کہا کوئلوں نے کہ اپنی تو کو کو فقط اپنے ہی ساتھیوں کے لئے ہے
پپیہوں نے اپنی رسیلی صدا میں کہا اپنا پی پی بھی اپنے لئے ہے
عصافیر نے بھی چہک کر کہا ہم کو تو آب و دانہ سے فرصت نہیں ہے
مگر درد میں ڈوب کر اپنا نغمہ وہ طائر مسلسل سناتا رہا
یہاں تک کہ جھلا کے کچھ طائروں نے کہا یہ گلستاں میں جاسوس ہے
-------O-------

ابنِ آدم کا گیت

میں فرزند آدم ہوں گیتی ہے میری یہ سورج مرا چاند تارے مرے ہیں
جہاں تا جہاں آسمان و زمیں کی تجلی مری اور نظارے مرے ہیں
چٹکتے ہوئے غنچوں کی راگنی ہر سحر گاہ بیدار کرتی ہے مجھ کو
صبا اپنے رقصِ طرب آفریں سے دمِ صبح سرشار کرتی ہے مجھ کو
اُبھرتا ہوا مہر روشن مجھے اپنی کرنوں کے دیتا ہے بڑھ کر پیالے
حرارت سے اک اک کرن بخشتی ہے مجھے زندگی میں جنوں خیز اجالے
مرے خیر مقدم کو آغوش وا ہیں چمن، کوہسار، آبشار اور صحرا
گھنے سائے ہیں راہ میں جا بجا سبز خطے ہیں مجھ کو حریر اور دیبا
عمارات خوب و خیابان رنگیں نگاہوں کے عشرت کدے ہیں سراسر
بسوں موٹروں رہ رووں کی صدائیں سماعت کے گلشن میں کھلتے گلِ تر
ہر اک گام پر دن کے ہنگامہ ہائے حسیں بھی مجھے نغمہ جاں فزا ہیں

تکلم کی ندیاں رواں ہیں جہاں بھی مرے واسطے سحر کی ہیں صدائیں
حسین جلوے قوس قزح کی طرح جیسے عشرت بداماں ہوں میرے لئے ہی
ہر اک گام پر رنگتیں جلوہ افشاں گلستاں گلستاں ہوں میرے لئے ہی
ہوا لمس راحت کی لے کر بہاریں مرے واسطے جابجا گھومتی ہے
مری مستیوں کی سرور آفرینی سے اک ایک موج صبا جھومتی ہے
بتوں کے تبسم تکلم ترنم غرض سب ادائیں خوشی کے خزانے
جو وجد آفریں سحر و افسوں کے خوابی جزیروں کے پھیلاتے ہیں تانے
بانے
تھکا ماندہ خورشید جب وقتِ مغرب سحر تک کی رخصت کے بھرتا ہے
پیالے
شفق روئے مے گوں کے جلوے بکھیرے لُٹاتی ہے کچھ ارغوانی اجالے
اترتی ہے جب شام سطحِ زمین کو مہیں آبنوسی لبادے اوڑھائے
تو چمکے مری روح کی وسعتوں میں چمک اٹھتے ہیں کتنے روشن دیئے سے
شب آتی ہے اپنے جلو میں ہزاروں چراغوں کی روشن پھواریں لٹاتی
زمین پر چراغ اور حسیں قمقموں کی فلک پر ستاروں کی کرنیں اڑاتی
تو ہر گوشہ و بام و در میں ابھرتے ہیں سحر و فسوں کے سے منظر
ابھرتی ہوئی روشنی کی پھواریں ہوں جیسے مرے واسطے ہی فروزاں
ہر اک گھر ہر اک رہگزار و خیاباں چراغاں چراغاں درخشاں درخشاں
کبھی محفلوں میں کبھی میکدوں میں کبھی رقص گاہوں میں عشرت کدوں
میں
مرے کیف و راحت کی پیہم ابھرتی ہوئی منزلیں ہیں حبس سلسلوں میں
یوں ہی رات ڈھلنے پہ شب گاہ کی سمت جاتا ہوں مسرور و مخمور و شاداں
ہر اک انگ پیہم فشار مسرت سے کچھ متصل کچھ گریزاں گریزاں
جہاں راحت بسترِ کنج عزلت مجھے اپنی آغوش میں بھینچتی ہے
خموشی کی لوری سناتی ہے مجھ کو دکھاتی ہے خوابوں کے رنگیں جزیرے
یہ شام و سحر اور یہ روز و شب ہیں مرے واسطے عشرتوں کے خزانے
یہ سبزہ یہ شبنم یہ پھول اور گلشن یہ مہر درخشندہ اور چاند تارے
کبھی کُو و بازار و شہرِ وطن میں کبھی دشت و صحرا و کوہ و چمن میں
کہیں بھی ہو خوشیاں سدا ناچتی ہیں مرے مست بیباک بے فکر من میں
محبت ہر اک پھول سے ہے وہ چاہے کسی بھی چمن اور وادی کا گل ہو

یہ چاہت سرودِ سکوت آفریں ہے یہ لازم نہیں ہے کہ بانگِ دہل ہو
میں حدِ زمان و مکاں میں بھی رہ کر زمان و مکاں میں مقیّد نہیں ہوں
کہ میرا دل آزاد ہے جس کی خاطر کسی بھی جہاں میں مقیّد نہیں ہوں
اگرچہ زمیں دامنِ مہرباں ہے یوں ہی حال پر مہرباں آسماں ہے
مگر میری نظروں میں میری محبت ہی میری حیات اور میرا جہاں ہے

-------O-------

منزل کا خواب.......

میں شدّتِ خستگی کے صحرائے بیکراں میں بھٹک رہا ہوں
جہاں ہر اک ذرہ ایک پتھّر سا اور پتھر پہاڑ سا ہے
غموں کا ایک کوہسار سا ہے
جہاں خموشی کے دیوداروں کی نکہتیں بھی تھکی ہوئی ہیں
ہر ایک موجِ اُمید حسرت کا تودۂ خاک بن رہی ہے
ہزاروں لاکھوں ہی داستانوں کے بے صدا سلسلے پڑے ہیں
مٹے ہوئے ان گنت نظاروں کی گرد کے ڈھیر لگ رہے ہیں
ہزاروں بنتی بگڑتی شکلوں میں کوئی آواز تک نہیں ہے
صدائے دمساز تک نہیں ہے
ہر اک رگِ زندگی سمِ ریگ زار سے درد سہہ رہی ہے
ہوا بھی چپ چاپ بہہ رہی ہے
تمام ہستی بس ایک دشتِ سموم سی بن کے رہ گئی ہے
جہاں اُفق پر گئے دنوں اور بیتے لمحوں کے کارواں سے ابھر رہے ہیں
جو چپکے چپکے بکھر رہے ہیں
تمام اُمیدیں تمام نقشِ حیات مسموم ہو رہے ہیں
مگر یہ رفتار بھی کچھ ایسی ہے جیسے تصویر سی بنی ہو
جو جا بہ جا سو بہ سو پڑی ہو
یہ لذّتِ خستگی سرابِ اُمید عشرت اگر نہیں ہے
تو روح کو کیوں سفر نہیں ہے
جو غم کے بارِ گراں کے پیہم فشار سے یوں دبک رہی ہے
کہ ہر تمنا سسک رہی ہے
فتادگی خود مری نگاہوں میں ایک منزل سی بن رہی ہے

جہاں ہر ایک لختِ روزنِ دل شکستگی کا سماں بنا ہے
کہ جیسے کوئی جہاز طغیانیوں کی زد میں بکھر گیا ہو بھٹک رہا ہو
شکستہ دل جس کا ناخدا ہو
جنھیں ہواؤں نے اور موجوں نے ایک ویراں سے جزیرے کی وسعتوں میں
کہیں بہت دور ایک عکسِ جمالِ منزل کا خواب بن کر اُبھر رہا ہے
یہ عکس اگر تابناک ہو کر مرے عزائم کو تازگی دے
تو ہر تمنا کو سرخوشی دے کے شوقِ منزل کو زندگی دے

-------O-------

اُجالوں کو روکیں تو جانیں

چراغِ تمنا بھی روشن نہیں ہے
خموشی کے قصرِ وفا آفریں میں ہے
وہ چہرہ جو یادوں کی چلمن سے پیہم اُبھرتا رہا ہے کہیں گم گیا ہے
ستاروں کے روشن دیئے بھی نہیں ہیں نگہبانِ شب بھی کہیں چھپ گیا ہے
ہر اک کنگرہ بادلوں کے ہزاروں غلافوں میں لپٹا ہوا سو رہا ہے
لبِ بام و دیوار و در کی فضائیں اُبھرتی ہوئی ظلمتوں میں گھری ہیں
نہ کوئی صدا ہے نہ آوازِ پا ہے
عجب سی فضا ہے
ہوا ایک مدّت کی جاگی ہوئی مضمحل مطربہ کی طرح سو گئی ہے
کبھی یہ شبستانِ خوابِ طرب تھا جہاں لاکھوں جلوے اُبھرتے رہے ہیں
جہاں بام و در پر ہزاروں سجیلے چراغوں کی کرنوں کا جادو جگا ہے
جہاں میرے بازو خیالوں کی دیوی کی گردن میں پیہم حمائل رہے ہیں
بہاروں نے جس پر لٹائی ہے خوشبو
چناروں نے جس کو سجایا ہے ہر سُو
جہاں زندگی ناچتی کودتی اپنی سرمستیوں میں غزل خواں رہی ہے
جہاں ذرّہ ذرّہ گلستاں رہا ہے
جہاں عشرتوں کا چراغاں رہا ہے
جہاں نرم کلیوں دمکتے شگوفوں، مہکتے گلابوں کا مسکن رہا ہے

جہاں روشنی، رنگ، آواز مل کر
ہواؤں کی موجوں میں بہتے رہے ہیں
مگر آج جہاں یہ کیسا سماں ہے؟
نہ رنگت نہ نکہت نہ کوئی ضیا ہے
فقط دل ہے جو بے صدائی کے عالم میں بھی روح کو تھپکیاں دے رہا ہے
وہ تھپکی جو کہتی ہے ناداں اگر وہ سے اب نہیں ہیں تو کچھ نہیں ہے

-------O-------

جہاں میں ہوں

جہاں میں رہا ہوں وہاں لاکھوں افعی زبانیں نکالے لپکتے رہے ہیں
ہر اک گام پر اژدہے اپنے منہ سے جہنم کی سی آگ اگلتے رہے ہیں
فضاؤں میں بھی نیلگوں بجلیاں سی مرے دائیں بائیں چمکتی رہی ہیں
ہوائیں بھی مسموم ہوتی رہی ہیں
زمیں بھی شرارے اُگلتی رہی ہے
ہزاروں ہی مارِ سیہ بھی اڑے ہیں
جو ڈسنے کی خاطر مرے چاروں جانب بھنور کی طرح گھومتے بھی رہے ہیں
عقارب بھی ڈنگ آزماتے رہے ہیں
کبھی ہاتھی گینڈے لپکتے رہے ہیں
کبھی اُلوؤں نے سنائی ہیں چیخیں
کبھی گیدڑوں کی بھی بھبکی سنی ہے
اُبھرتی ہوئی حسرتوں کے ہزاروں بگولوں نے قدموں کی لغزش بھی دی ہے
اندھیروں نے بھی راہ کو گم کیا ہے
ستارے بھی نظروں سے اوجھل رہے ہیں
حسیں چاند بھی جانے کن ظلمتوں سے بھری وادیوں میں بھٹکتا رہا ہے
مرا دل مسلسل دھڑکتا رہا ہے، مچلتا رہا ہے
ہزاروں بھیانک صدائیں بھی تاریکیوں میں مسلسل اُبھرتی رہی ہیں
میں لیکن کئی چوٹیوں گھاٹیوں سے گزر کر تری سمت بڑھتا رہا ہوں
مگر مجھ کو ان موذیوں سے غرض کیا
تجھے کیا مری جان منظور ہے؟

-------O-------

تودۂ خاک

تودۂ خاک ہیں یہ بت سیم تن
تودۂ خاک سے جلوہ مطلوب ہے؟
یوں خریدے ہوئے چند خستہ بدن
پیچ و خم کھا کے لہرا گئے بھی تو کیا
مضمحل جسم مجبور اداؤں کے ساتھ
گردشِ رقص میں آگئے بھی تو کیا
رقص تو روح کا وجد ہے دوستو
جسم و جاں کی ہم آہنگیوں میں سجائے
رقص تو شعلہ شوق ہے دوستو
بے قرارانہ سرمستیوں میں سمائے
تم تو مردار خور گدھ ہو جو لاش پر
پنجہ حرص کو آزماتے رہیں
جوش میں نوچ جائیں سڑے جسم کو
اپنے جی میں عفونت بساتے رہیں
ہم کو تو لاش کی بھی حرمت روا
اور زندوں کا تو اور بھی پاس ہے
ہم تو اس بزم سے اب چلے دوستو
گو تمہیں ایسی محفل بہت راس ہے
ہم کو نوعِ بشر سے اگر پیار ہے
تو یہ محرومیاں بھی ہیں ہم کو عزیز
جن سے غم کی راتیں ہیں مہکی ہوئی
جن سے دکھ درد کے دن بھی ہیں عطر بیز

-------O-------

رُباعیات

ایں کہنہ رُباط را کہ عالم نام است
آرام گہِ ابلقِ صبح و شام است
بزم یست کہ واماندۂ صد جمشید است
قصر یست کہ تکیہ گاہِ صد بہرام است
(خیام)

یہ کہنہ سرا ہاں جس کے لئے، عالم کا مثالی نام بھی ہے
جس طرفہ تغیّر خانہ میں، یہ ابلق صبح و شام بھی ہے
اس قصر کہن میں جتنے بھی، زورآور و جابر، غاصب تھے
تاریخ کے رخ پر دھبہ ہے، ان میں جو کسی کا نام بھی ہے
(سلیم واحد سلیم)

صحرا رخِ خود ز ابر نوروز بُشست
برخیز و بہ جام بادہ کن عہد درست
با سبز خطے بہ سبزہ زارے مے خور
برباد کسے کہ سبزہ از خاکش رُست
(خیام)

برسی ہیں گھٹائیں ساون کی، گلشن میں عجب ہریالی ہے
پھولوں پہ سجے ہیں موتی سے، موتی کی لڑی ہر ڈالی ہے
آ بزم سجائیں سبزہ پر، اور ہاتھ رکھیں پیمانے پر
چھلکائیں ان کے نام پہ بھی، وہ جن کی جگہ اب خالی ہے
(سلیم واحد سلیم)

آں قصر کہ بر چرخ ہمی زد پہلو
بر درگہ اوشہاں نہادندے رو
دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ
بنشستہ ہمی گفت کہ کوکو کوکو
(خیام)

وہ قصر کہ جن کے بام کبھی، افلاک سی رفعت رکھتے تھے
اور خونِ بشر کے متوالے، باشانِ امارت رکھتے تھے
اک ایسے محل کے کھنڈر پر، کل اک فاختہ گویا کہتی تھی
باقی ہے بشر لیکن ہیں کہاں، جو نخوت و سطوت رکھتے تھے
(سلیم واحد سلیم)

ما خرقۂ زہد در سر خم کردیم
وز خاک خرابات تیمم کردیم
باشد کہ درونِ میکدہ دریابیم
عمرے کہ درونِ مدرسہ گم کردیم
(خیام)

میخانہ کی گردِ فرش سے کی، تزئینِ تیمم مستی میں
چپ چاپ گرے ہیں سجدے میں، دیکھا جو کوئی خم مستی میں
جس یار کو برسوں گزرے ہیں، کھویا تھا عبادت خانے میں
سوچا کہ وہ شاید مل جائے، میخانے میں گم مستی میں
(سلیم واحد سلیم)

این قافلۂ عمر عجب می گزرد
در یاب دمیکہ با طرب می گزرد
ساقی غمِ فردائے قیامت چہ خوری
پیش آر پیالہ کہ شب می گزرد
(خیام)

یہ شام و سحر کے قافلے بھی، آتے ہیں عجب ہی ڈھب سے یہاں
راکب ہیں اگر لمحات طرب کھینچ اپنی طرف مرکب سے یہاں
مے نوشوں کے کل کا دھڑکا کیوں، ساقی تجھے غم کا کھٹکا کیوں
بے جام نہ گزرے رات کہیں، پیالہ تو لگا دے لب سے یہاں
(سلیم واحد سلیم)

زاں پیش کہ غمہات شبخون آرند
فرمائے کہ تا بادۂ گلگوں آرند
تو زرنہٗ اے غافل ناداں کہ تُرا
در خاک نہند و باز بیروں آرند
(خیام)

ایسا نہ ہو غم کی یورش ہو، شبخونِ حوادث آن پڑے
کہہ دو کہ گلابی آ جائے، چھلکائیں تو کام آسان پڑے
اک بار اگر مٹی میں پڑا، مٹی میں پڑا، رہ جائے گا
پھر ساتھ کہاں، ساتھی بھی کہاں، ممکن نہیں تجھ میں جان پڑے
(سلیم واحد سلیم)

مے خور کہ ز دل کثرت و قلت ببرد
و اندیشۂ ہفتاد و دو ملت ببرد
پرہیز مکن ز کیمیائی کہ ازو
یک جرعہ خوری ہزار علت ببرد
(خیام)

پی بادہ کہ دل کے گوشوں میں، اندیشۂ بیش و کم نہ رہے
ہفتاد و دو ملت کے جھگڑے، اور تفرقۂ عالم نہ رہے
پرہیز نہ کر اے جانِ جہاں، مے ہے وہ عجب اکسیر یہاں
اک جرعہ جو پی لے اوروں سے، برہم ہو اگر برہم نہ رہے
(سلیم واحد سلیم)

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو
(خیام)

ہے دہر کے افسوں خانہ میں، ناواقفِ عصیاں کون بتا؟
ناکردہ گنہ کس طرح جیا، ایسا ہے وہ انساں کون بتا؟
مجھ سے جو برائی سرزد ہو اور تو جو سزا دے وہ بد ہو
پھر مجھ میں تجھ میں فرق کرے، بالطفِ فراواں کون بتا؟
(سلیم واحد سلیم)

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کائے رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما
(خیام)

جب رات کٹی تو وقت سحر، گونجی یہ صدا میخانے میں
کیا رند میں کوئی جان نہیں، کیا ہوش نہیں دیوانے میں
اٹھ جام کو بھر اور جھوم کے پی، ہے سر پہ وہ وقتِ نازک بھی
جب موت کی مے چپکے سے بھرے، بے رحم قضا پیمانے میں
(سلیم واحد سلیم)

اے مفتی شہر از تو پرکار تریم
با اینہمہ مستی از تو ہشیار تریم
تو خونِ کساں خوری و ما خونِ رزاں
انصاف بدہ کدام خونخوار تریم
(خیام)

اے مفتیِ شہر اے شیخِ حرم، ہاں تم سے سوا ہشیار ہیں ہم
ہم مست سہی، غافل ہی سہی، تم سے تو بہت پرکار ہیں ہم
ہم رز کا لہو پیتے ہیں یہاں اور دولتِ مستی پاتے ہیں
تم خونِ بشر پی جاتے ہو، خونخوار ہو تم ، مے خوار ہیں ہم
(سلیم واحد سلیم)

قومے ز گزاف در غرور اُفتادند
قومے ز پے حور و قصور اُفتادند
معلوم شود چو پردہ ہا بردارند
کز کوئے تو دور دور اُفتادند
(خیّام)

اک قوم ہے وقفِ لاف زنی، انداز غرور آلودہ ہے
اک قوم خیالِ حور میں ہے، ذہن اس کا قصور آلودہ ہے
جلووں کی حقیقت کھول ذرا، چہرے سے نقاب الٹا کے بتا
دیدار کا دعویٰ یاروں کا، کس درجہ فتور آلودہ ہے
(سلیم واحد سلیم)

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
ویں حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوے من و تو
چوں پردہ بر اُفتد نہ تو مانی و نہ من
(خیّام)

ہاں رازِ وجود، اسرارِ ازل، مانا کہ نہ سمجھے آج تلک
ہاں یہ بھی بجا، حل ہو نہ سکے، کتنے ہی معمّے آج تلک
غفلت کی یہ کہر، ابہام کی دھند، چھٹ جائے گی آخر نظروں سے
اک دن تو بالآخر اٹھیں گے، جو پردے نہ اٹھے آج تلک
(سلیم واحد سلیم)

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد
وز بہر نشست آشیانے دارد
نے خادمِ کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد
(خیّام)

جو قوتِ بازو کے بل پر، اک نانِ جویں بھی رکھتا ہے
اور کارِ جہاں میں راحت کا، اک کنج کہیں بھی رکھتا ہے
عزت بھی اسی کو زیبا ہے، جینا بھی اسی کا جینا ہے
محروم یہ خادم انساں ہے اور بخت حسیں بھی رکھتا ہے
(سلیم واحد سلیم)

از واقعۂ ترا خبر خواہم کرد
واں زاہد و حرفِ مختصر خواہم کرد
با عشق تو در خاک فرو خواہم شد
با مہر تو سر ز خاک بر خواہم کرد
(خیام)

ہستی کے چمن میں برگِ خزاں، کی طرح میں جب کھو جاؤں گا
ہاں خاک کی چادر اوڑھ کے جب، نظروں سے نہاں سو جاؤں گا
دیکھو گے کہ تیرے پیار نے پھر، کس طرح سے آنکھیں کھولی ہیں
میں دیدۂ نرگس بن بن کر، دیدار طلب ہو جاؤں گا
-------O-------

متفرقات

انسانیت کے مہر و وفا کے نہ ہوں جو رنگ
دیوار و در کسی کے منقش ہوا کریں

شاکی جو ہیں سلیم ہمارے سکوت پر
لازم ہے ان کو اب کہ ذرا سی حیا کریں

.........O.........

ترے سودائے الفت کو دیوانے سے کیا نسبت
بیابانِ جنوں کو تنگ ویرانے سے کیا نسبت

وہ محفل جس میں ہو محبوب کے جلووں کی تابانی
سلیم اس بزمِ رنگیں کو صنم خانے سے کیا نسبت

.........O.........

قتلِ گاہِ آبرو ہر کوچہ و بازار ہے
اور اگر بچ کر چلے کوئی صلیب و دار ہے

زندگی فن ہے اور اس کا اک نہ اک معمار ہے
ہر قدم پھر کس لئے گرتی ہوئی دیوار ہے

.........O.........

بچھڑے تو جب بھی وسوسۂ این و آں میں تھے
پہلو عجب عجب خلشِ رائیگاں میں تھے

جب تک تھا اس نظر کا سہارا زمیں نہ تھی
جیسے کہ ہم ورائے فلک، آسماں میں تھے

.........O.........

مردانگی کی شان ہوئی کتنی مضمحل
ہے ذہن اب ٹھکانے پہ اپنے نہ جان و دل

لطف آئے زندگی کا اگر ساتھ شب کٹے
دیکھو تو کیا بہار دکھاتے ہیں آب و گل

.........O.........

ہرنیوں کے لبوں پہ ذکرِ غزل
غم کے صحرا میں ہے عجب جل تھل

سماں پر جھکی جھکی سی گھٹا
پھیلا پھیلا سا اک حسیں آنچل

.........O.........

شرارِ غم سے جو روشن کئے خوشی کے چراغ
تو روشنی میں تھے یکتا یہ آگہی کے چراغ

سبھی ہیں مادرِ گیتی کے بے بہا فرزند
جلائے جائیں گے ہم مہرِ باہمی کے چراغ

.........O.........

مقام دار و رسن ہم سے جب بلند ہوا
ستم گروں کا خیالِ ستم دوچند ہوا

صلیب و دار کے وہ بھی ہیں مدعی کہ جنہیں
ہر اک مقام جو گل پوش تھا پسند ہوا

.........O.........

لاکھوں آوازیں، ہزاروں رنگ، لاکھوں نکہتیں
تو نہیں ہوتا تو کیا گلزار دکھلاتا ہے دل

آتے جاتے لمحے اب کیا کیا دکھاتے ہیں سماں
آتی جاتی سانس میں جاتا ہے دل آتا ہے دل

.........O.........

آنچ آئے نہ لالہ و گل پر
ایسی ترتیبِ حادثات کریں

رات گذری ہے میکدے میں سلیم
میکدے ہی میں دن کو رات کریں

.........O.........

طبیعت ماورائے کفر و ایماں ہے جہاں میں ہوں
عروسِ آدمیت جلوہ ساماں ہے جہاں میں ہوں

.........O.........

ہجومِ غم میں مرے دل کی پاسباں تھی کبھی
وہ اک نظر کہ محبت کی ترجماں تھی کبھی

.........O.........

جو گزر رہی ہے دل پر کھلے کس طرح سے تم پر

کبھی ہم ہیں تم سے ناخوش کبھی تم ہو ہم سے برہم

........O........

تری فغاں نہ کسی پر گراں گزر جائے
سنبھل سنبھل، کہ محبت کی بارگاہ میں ہے

........O........

یہی تھا غم کہ ترا دل نہ ٹوٹ جائے کہیں
لبوں پہ آ کے رکی ہیں کہانیاں کیا کیا

........O........

خود اپنی ذات کی مانند تم کو چاہا ہے
انا کو تم نے جو توڑا تو پھر دھرا کیا ہے

........O........

بہہ رہے ہیں اشکِ غم آنکھوں میں اور کوئی نہیں
جو کہے ان آنسوؤں کو دامنِ دل میں سنبھال

........O........

ابد کا رنگ لہو ہی کا رنگ ہے ورنہ
کوئی بھی رنگ زمانے میں پائیدار نہیں

........O........

ابد کی لوح پہ لکھا گیا ہے نام ترا
دلوں سے محو نہ ہو گا کبھی مقام ترا

........O........

وہ اہلِ غم جنہیں غم کا بھی اب نہیں احساس
ذرا انہیں بھی ہنساؤ تو کوئی بات بنے

........O........

اور بھی بڑھ گئے بے تابیٔ دل کے آثار
ہائے وہ اشک جو دامن میں اتارے نہ گئے

........O........

اک چہرہ یادوں کے بھنور میں ساحل ساحل جھانک رہا ہے
آنسو آنسو دریا دریا غم کا صحرا پھانک رہا ہے

........O........

پیامِ آسمانی کے خیالِ خام کے بدلے
زمین و آسماں میں اب بشر کا نام کرنا ہے

........O........

یہ کیا کہ ایک چپ میں زمانہ گزر گیا
کربِ سکوت ہی کا سبب کچھ بتاؤ تم

ضمیمہ جات

ضمیمہ (الف)

(غیر مدون شعری مواد)

(I) غزل

۱۔ کارواں باقی ہے، آوازِ جرس باقی ہے

(ان ق، لاہور، جنوری ۱۹۴۵ء)

۲۔ تیری جفا کا شکر ادا کر سکے نہ ہم

(ادبی دنیا، لاہور، فروری ۱۹۴۵ء)

۳۔ ہر آرزو کا خوں بت آشفتہ خُو نہ کر

(ادبی دنیا، لاہور، اپریل ۱۹۴۵ء)

۴۔ بزمِ امکاں میں ہے ہر سمت اُجالا تجھ سے

(روز نامہ انقلاب، لاہور، ۱۳۔ مارچ ۱۹۴۸ء)

۵۔ چشم تر سے سیل اشکِ غم رواں ہوتا رہا

(ساقی، کراچی، اپریل ۱۹۴۹ء)

۶۔ مجھے حوادث کی برق سامانیوں کا خوف و خطر نہیں ہے

(مخزن، لاہور، جون ۱۹۴۹ء)

۷۔ کہیں یہ بات بھی اے دوست ناگوار نہ ہو

(ساقی، کراچی، اپریل ۱۹۴۹ء)

۸۔ فسونِ جذبِ محبّت بروئے کار آیا

(مخزن، لاہور، دسمبر ۱۹۴۹ء)

۹۔ نور و نکہت کی کوئی بات کریں

(ادبِ لطیف، لاہور، اپریل ۱۹۵۰ء)

۱۰۔ ہمارے لہجے میں گو تلخیِ حیات بھی تھی

(مخزن، لاہور، جنوری ۱۹۵۱ء)

۱۱۔ اشکوں سے آستیں کو بھگوئے ہوئے سے ہیں

(ہمایوں، لاہور، سالنامہ ۱۹۵۱ء)

۱۲۔ اپنا رنجِ ناکامی جاگ جاگ اٹھا اے دل

(ادبی دنیا، لاہور، جولائی ۱۹۵۲ء)

۱۳۔ مسکرا کر بھی مسکرا نہ سکے

(ادبی دنیا، لاہور، نومبر ۱۹۵۲ء)

۱۴۔ میں کہ ہوں مارا ہوا دل کا، جنوں کا آشنا

(ادبی دنیا، لاہور، جون ۱۹۵۳ء)

۱۵۔ تری نظر سے اگر بات ہو نہ پائے گی

(دستور، لاہور، جولائی ۱۹۵۳ء)

۱۶- یقیں نہ آئے گا بے مہر بے یقینوں کو
(ادبِ لطیف، لاہور، فروری مارچ ۱۹۵۴ء)
۱۷- بن کھلے جب کوئی معصوم کلی مرجھائی
(نقوش، لاہور، مارچ ۱۹۵۴ء)
۱۸- تیرا جلوہ ہے خنک اوس چمن میں جیسے
(ادبی دنیا، لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء)
۱۹- صدا ہم نے لگائی دشت میں بے سوچے سمجھے بھی
(ادبی دنیا، لاہور، نومبر ۱۹۶۵ء)
۲۰- ترکِ ربط وضبط، قطع دوستی بھی تو نہ تھی
(ادبی دنیا، لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء)
۲۱- خشک دریا ہیں سو وہ بھی ریگ بے نم کی طرح
(ادبی دنیا، لاہور، فروری مارچ ۱۹۶۶ء)
۲۲- دوسروں کے آنسوؤں سے بجھ بھی جاتی ہے وہ آگ
(ادبی دنیا، لاہور، اپریل ۱۹۶۶ء)
۲۳- کیا لطف مل سکے گا سلام و پیام میں
(ادبی دنیا، لاہور، جولائی ۱۹۶۶ء)
۲۴- بس ایک تصوّر کہ مجسم ہو سو تو ہے
(ادبی دنیا، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء)
۲۵- ہر ورق زرد ہے کہاں جائیں
(ادبی دنیا، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء)
۲۶- ساقی یہ کیا سماں ہے، یہ کیا انقلاب ہے
(ادبی دنیا، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء)
۲۷- کسے پڑی ہے کہ دکھ میں کسی کے کام آئے
(ادبی دنیا، لاہور، فروری ۱۹۶۷ء)
۲۸- شفق رنگ میں خوشبوئے زلفِ یار تو ہے
(ادبی دنیا، لاہور، فروری مارچ ۱۹۶۸ء)
۲۹- ہر قدم حسینوں کی شانِ خود نمائی ہے
(ادبِ لطیف، لاہور، سالنامہ ۱۹۶۸ء)
۳۰- رازداروں نے دکھ دیے ہیں بہت
(نیرنگِ خیال، لاہور، غزل نمبر، نومبر ۱۹۷۰ء)

۳۱- روح کی شعلہ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو
(نیرنگِ خیال، لاہور، غزل نمبر، نومبر ۱۹۷۰ء)
۳۲- پیکرِ تمنا کا چہرہ دیکھنا ہوگا
(نیرنگِ خیال، لاہور، غزل نمبر، نومبر ۱۹۷۰ء)
۳۳- حق بات نکالیں گے بہر حال لبوں سے
(نیرنگِ خیال، لاہور، غزل نمبر، نومبر ۱۹۷۰ء)
۳۴- غرورِ تحکم، فریبِ پیہم، سرشتِ سرمایہ دار میں ہے
(سویرا، لاہور، ۷،۸)
۳۵، ہزاروں بھٹکی ہوئی امیدوں کے نقش دل پر ابھار آئے
(سویرا، لاہور، ۱۰، ۱۱)
۳۶- صدائے درد جب اٹھی تو کوئی سن نہ سکا
(سویرا، لاہور، ۱۲)
۳۷- جو دل میں تمنا نہ ہو تو کیا کیجے
(دوست، لاہور، جلد ۵، شمارہ ۸)
۳۸- کڑی نگاہوں سے میری جانب زمانہ چاہے ہزار دیکھے
(ادبی دنیا، لاہور، خاص نمبر، دورہ پنجم، شمارہ دوم)
۳۹- نہ ہے سکوں کو دوام اور نہ درد ہی کو ثبات
(ادبی دنیا، لاہور، خاص نمبر، دورہ پنجم، شمارہ سوم)
۴۰- ابھرتا ڈوبتا رہتا ہے زندگی کا جنوں
(ادبی دنیا، لاہور، خاص نمبر ۱۲)
۴۱- چُنیں گے کیا گلِ رخسار اس آتش پرستی میں
(ادبی دنیا، لاہور، شمارہ نمبر ۱۶)

-------O-------

ضمیمہ (الف)

(غیر مدون شعری مواد)

(II) نظم

۱۔ دُوری
(ادبِ لطیف، لاہور، اپریل ۱۹۵۴ء)
۲۔ جدائی
(ادبِ لطیف، لاہور، مئی ۱۹۵۴ء)
۳۔ قربِ اولین
(مشرب، کراچی، نومبر ۱۹۵۵ء)
۴۔ ۶ ستمبر
(ادبی دنیا، لاہور، نومبر ۱۹۶۵ء)
۵۔ شہید کی ماں
(ادبی دنیا، لاہور، نومبر ۱۹۶۵ء)
۶۔ سر عقیدت سے جھکنے پہ مجبور ہے
(ادبی دنیا، لاہور، نومبر ۱۹۶۵ء)
۷۔ ایک گاؤں کئی گاؤں
(ادبی دنیا، لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء)
۸۔ عجب سماں ہے
(ادبی دنیا، لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء)
۹۔ اگر جنت حقیقی روپ دھارے
(ادبی دنیا، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۶۶ء)
۱۰۔ تمنا ہے تری وادی میں عمر اپنی بتاؤں میں
(ادبی دنیا، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۶۶ء)
۱۱۔ چھنی کیمپ
(ادبی دنیا، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۶۶ء)
۱۲۔ موجِ خیال
(نیرنگِ خیال، لاہور، جولائی اگست ۱۹۶۶ء)
۱۳۔ نالۂ فراق
(ادبی دنیا۔ لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء)
۱۴۔ سدا سہاگن
(ادبی دنیا، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء)
۱۵۔ مرا بھائی
(ادبی دنیا، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء)

۱۶- عظیم شفقت

(روز نامہ آفتابِ جدید، بھوپال، ۲۲ اگست ۱۹۸۲ء)

و

(ادبی دنیا- لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء)

۱۷- ایک پہیلی

(ادبی دنیا، لاہور، جنوری فروری ۱۹۷۰ء)

۱۸- نوائے فراق

(ادبی دنیا، لاہور، دورہ پنجم، شمارہ دوم)

۱۹- تذبذب

(ادبی دنیا، لاہور، شمارہ ۱۶)

۲۰- گمنامی

(ادبی دنیا، لاہور، دورہ ششم، شمارہ ۲۷)

ضمیمہ (الف)

(غیر مدون شعری مواد)

(III) رباعی یا قطعہ

(۱)- گردوں ز زمیں، ہیچ گلے برنارد
خیّام

(مٹی کی تہوں سے کرکے نمو جو پھول چمن میں لہرایا)
سلیم

(۲)-از روئے حقیقی و نہ از روئے مجاز
(سچ مچ کا تماشا خانہ ہے کب کھیل جہاں کا مجازی ہے)

(۳)- ابریق مئے مرا شکستی ربی
(توڑا سرِ بزمِ عشرت کیوں مینائے مئے رنگین مرا)

(۴)- از جملہ رفتگانِ این راہِ دراز
(کب کوئی گزر کر ہستی سے پھر جامۂ ہست میں آیا ہے)

(۵)- ایں قافلۂ عمر عجب می گزرد
(یہ شام و سحر کے قافلے بھی آتے ہیں عجب ہی ڈھب سے یہاں)

(۶)- با بادہ نشیں کہ ملکِ محمود این است
(ہاں محفلِ ناؤ نوش رہے پائندہ یہی جاگیر تو ہے)

(۷)- یاراں چوں باتفاق معیاد کنید
(جب جام و سبو کا دور چلے مل بیٹھیں پرانے ساتھی بھی)

(۸)- در فصلِ بہار اگر بُتِ حور سرشت
(اس سحر سے بڑھکر کچھ بھی نہیں، بر روئے زمیں بر عرش بریں)

(۹)- من بادہ بجام یک منی خواہم کرد

(ہاں ہاں میں پیوں گا پے در پے کنٹر سے شرابِ انگوری)

(۱۰)- در دشتے کہ لالہ زاری بودہ است
(جو دشت بھی اک آتا ہے نظر، پھولوں کا ٹھکانا ہوتا تھا)

(۱۱)-در دہر کسے بہ گلعذارے نہ رسید
(جو نشترِ غم سے بچ کے رہا، کب سادہ رخوں سے تک پہنچا ہے)

(۱۲)-یک چند بکودکی باستاد شدیم
(اک عہد وہ طفلی کا تھا کہ جب، مکتب کی سبق خوانی میں رہے)

(۱۳) کردیم دگر شیوۂ رندی آغاز
رندوں کا جو شیوہ اپنایا، پھر سارے جہاں سے پیار کیا

(۱۴) خیّام کہ خیمہ ہائے حکمت می دوخت
حکمت کے جو خیمے سیتا تھا، سنتے ہیں کہ وہ خیّام گیا

(۱۵) کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد
تقدیر و قضا اک پرچھائیں، جو عقل و خرد پر پردا ہے

(۱۶) در دہ پسراں مے کہ جہانرتاب ست
لامغنچہ دارو جس سے یہاں تابندہ نگارِ ہستی ہے

(۱۷) گر مے نہ خوری طعنہ مزن مستاں را
تقویٰ کے تفاخر رہنے دے اور زعم نہ بادہ پینے کا

(۱۸) یزداں چو گلِ وجودِ مارا آراست
جو قادرِ مطلق جوہر ہے ہر گل کا بہارِ ہستی کا

(۱۹) یک یک ہنرم بیں و گنہ دہ دہ بخش

لے عفو سے کام اور بخش خطا اس عرضِ ہنر کے بدلے میں

(۲۰) گویند ترا چو سوربا حور خوش است
کہتے ہیں کہ وصلِ حور ملے باعشرتِ باغِ رضوانی

(۲۱) ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودست
یہ کوزۂ مے میری ہی طرح تھا عاشقِ زار و مستانہ

(۲۲) گل گفت کہ من یوسف مصر چمنم
اک گل نے کہا میں یوسف ہوں اور مصر چمن میں رہتا ہوں

(۲۳) شخصے بزنے فاحشہ گفتا مستی
اک فاحشہ سے زاہد نے کہا یہ مستی فسق و فجوری ہے

(۲۴) یارب بہ دل اسیر من رحمت کن
جو غم کے دھوئیں سے گھٹتا ہے اس سینہ و جاں کو راحت دے

(۲۵) خورشید کمند صبح بر بام افگند
کھول آنکھ نظر دوڑا تو ذرا، وہ شب کے طلسمی رنگ گئے

(۲۶) آنہا کہ ز پیش رفتہ اند اے ساقی
جو لوگ روانہ ہو بھی چکے اس دہرِ کہن سے اے ساقی

(۲۷) از گردش چرخ ہیچ مفہوم نیست
اس چرخِ کہن کی گردش کا مفہوم ہے کیا معلوم نہیں

(۲۸) از درس علوم جملہ بگریزی بہ
ہاں جملہ علوم سے بہتر ہے شیریں دہنوں کی بات آئے

(۲۹) گویند ازاں کساں کہ با پرہیز اند

کہتے ہیں جو اہلِ تقویٰ ہیں، تقویٰ میں اٹھائے جائیں گے

(۳۰) یک جام ہزار مرد بادیں ارزد
اک بادہ کشِ مستانہ یہاں دینداروں کی صف پر بھاری ہے

(۳۱) جانم بفدائے آنکہ او اہل بود
جو قابلِ عشق و محبت ہے اس جانِ جہاں پر مرتے ہیں

(۳۲) خواہی کہ ترا رتبت اسرار رسد
ہستی کا جو رازِ سربستہ کھولو گے یہ نکتہ پاؤ گے

(۳۳) گویند کہ مرد را ہنر می باید
کہتے ہیں ہنر سے زیبائش مردانِ جہان کی ہوتی ہے

(۳۴) گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت
اغراض و ہوس کی آگ میں کیوں جل جل کے عدم کی سمت چلیں

(۳۵) اے آمدہ از عالم روحانی تفت
روحوں کے جہاں سے آمد کا دعویٰ ہے تو حیرت کیوں ہے تجھے

(۳۶) دارندہ چو ترکیب طبائع آراست
ترکیبِ عناصر طبع بشر فطرت کی یہ ساری محفل بھی

(۳۷)اکنوں کہ جہان رابخوشی دسترسی ست
(جب باغِ جہاں میں عشرت کی گھنگھور گھٹائیں چھا جائیں

(۳۸) در دہ قدحے ز لعل ناب اے ساقی
غم جس سے اڑے اس دارو سے اک پیالہ ادھر بھی اے ساقی

(۳۹) ما ؤ مے و معشوق و صبوح اے ساقی

مے سامنے ہو مے رخ بھی رہے ہر صبح صبوحی ہو جائے

(۴۰) ایں چشم پیالہ بیں بجاں آ بستن
جن آنکھوں میں رنگ ساغر ہے، وہ رنگ فسوں سے بڑھ کر ہے

(۴۱) وقتے کہ طلوع صبح ازرق باشد
جب نیل کے بحرِ مدوّر پر انوارِ سحر کا دامن ہو

(۴۲) چوں لالہ بنوروز قدح گیر بدست
لالہ کی طرح ہو جام بکف گلزار و بہارِ ہستی میں

(۴۳) گر بادہ بکوہ برزنی رقص کند
کہسار بھی مے پی سکتے اگر اور جام چڑھاتے یاروں میں

(۴۴) بابط می گفت ماہی در تب و تاب
اک بطخ سے اک ماہی نے کہا، کیا درد بھری بے تابی سے

(۴۵) آں قصر کہ بہرام در و جام گرفت
وہ قصر و محل جن میں تھے کبھی شاہوں کے طرب کے ہنگامے

(۴۶) شمع است و شراب و ماہتاب اے ساقی
مہتاب و شرابِ احمر ہے اور شمعِ منور اے ساقی

(۴۷) گویند ترا چو سور با حور خوش ست
یہ فصل بہار و تختۂ گل، ندی میں یہ موجیں پانی کی

(۴۸) از مے طرب و نشاط و مردی خیزد
مردانہ صفت جینے کے لئے بادہ میں پیامِ عشرت ہے

(۴۹) سستی مکن و فریضۂ حق بگذار

ہاں رسمِ ستم سے ہاتھ اٹھا، طاعت ہے یہی تقصیر نہ کر

(۵۰) بگزار دلا وسوسۂ عقل معاش
ہے عقل، مفادِ ذات عبث لے کام نہ کچھ عیاری سے

(۵۱) ہنگامِ صبوح ست و خروش اے ساقی
ہے وقت صبوحی اے ساقی، ہنگامِ خروشِ مستانہ

(۵۲) در سنگ اگر شوی چو نار اے ساقی
ڈھونڈیں گے جو ساقی جائے اماں محلاتِ بلند و بالا میں

(۵۳) چوں ہست زمانہ در شباب اے ساقی
لاباده کہ روئے ہستی پر پھر رنگِ بہار شتابی ہے

(۵۴) بیمارم و تپ در استخوانم دارم
رگ رگ میں تپش ہے شعلوں کی ہر ریشہ بدن کا جلتا ہے

(۵۵) احوال جہاں بر دلم آساں می کن
ہے کوئی کریم و رحیم اگر مشکل کو نہ کیوں آسان کرے

(۵۶) آورد باضطرابم اول بوجود
بن بن کے مجسم بے تابی جو بزمِ وجود میں آئے ہیں

(۵۷) چوں عشق ازل بود مرا افشا کرد
جو جود و عطا کے لمحے میں ہم کو بھی حیات دہر ملی

(۵۸) ساقی گل و سبزہ بس طربناک شدہ است
پھر سبزہ و گل پر لہر آئی اور دور ہر اک غمناکی ہے

(۵۹) حق جان جہان ست و جہاں جملہ بدن

ہر زندہ بدن میں جاری ہیں امواجِ حیاتِ ربّانی

(۶۰) بس خونِ کساں کہ چرخ بیباک بریخت
کتنوں کے حساب ہستی کو بے رحم فلک نے پاک کیا

(۶۱) بوسیدہ مرقع اند ایں خامے چند
جو صدق و صفا سے عاری ہیں وہ مکر و ریا کے بندے ہیں

(۶۲) خطیکہ زر وے یار برخاستہ شد
اس سبزۂ خط سے حسن بڑھا کب کم وہ جمال یار ہوا

(۶۳) مے نوش کہ عمر جاودانی این است
پی بادہ کہ عمر فانی میں جرعاتِ بقا ہیں ساغر میں

(۶۴) آں مے کہ حیات جاود این ست بنوش
پی بادہ کہ تو بھی فانی ہے، یہ ملکِ بقا کا پانی ہے

(۶۵) درد ہر چہ آوازۂ گل تازہ دہند
جب باغِ جہاں میں پھول کھلیں بازار میں گجرے آنے لگیں

(۶۶) چوں بادہ خوری زعقل بیگانہ مشو
دامانِ خرد کو چھوڑ نہ دے جب دور میں ساغر آ جائے

(۶۷) بردار پیالۂ و سبو اے دلجو
ندّی کے کنارے سبزے پر سامانِ طرب کو جمع کریں

(۶۸) آں را کہ وقوف است بر احوالِ جہاں
جو واقفِ رازِ حقیقت ہے احوالِ جہاں کا دانا ہے

(۶۹) در عالم جاں بے ہوش میباید بود

غواصیِ بحرِ صداقت میں لازم ہے بہت کچھ زور کریں

(۷۰) آباد خرابات ز مے خوردن ماست
ساقی یہ جہانِ مے خانہ آباد ہوا ہے جس دم سے

(۷۱) زیں گنبد گردندہ بد افعالی ہیں
دل پر ہیں بہت سے زخم یہاں اس چرخِ کہن کے ہاتھوں سے

(۷۲) صیاد نہ حدیث نخچیر مکن
ہیں صید نہ ہم صیاد یہاں، کیوں ذکرشکار و شکاری ہو

(۷۳) ساقی علم سیاہ شب صبح ربود
وہ ظلمتِ شب کے پرچم سب انوارِ سحر میں ڈوب گئے

(۷۴) ساقی دل من کہ شادی از غم نشناخت
جو غم کو اُڑانے والی ہے حاصل ہے تو ساقی کیا غم ہے

(۷۵) ساقی قدحے کہ کار عالم نفسے است
یہ سانس کی ڈوری جب تک ہے، ہے کارِ جہاں بھی اے ساقی

(۷۶) رفتند و ز رفتگاں یکے ناید باز
جو بزم جہاں سے جاتا ہے وہ لوٹ کے پھر کب آتا ہے

(۷۷) مگذار کہ غصّہ در حرارت گیرد
کیوں غصہ و غم کے گھیرے ہوں اور رنج و الم کے پھیرے ہوں

(۷۸) جامے و مے و ساقی برلبِ کشت
ندّی کے کنارے سبزے پر ساقی یہ سبو و پیمانہ

(۷۹) زاں پیش کہ نام تو ز عالم برود

قبل اس کے کہ اپنا نام مٹے اس لوحِ وجودِ خاکی سے

(۸۰) تاچند اسیر عقل ہر روزہ شویم
کیوں عقلِ غرض پرور سے یہاں دنیا کا خلوص خراب کریں

(۸۱) من بادہ خورم و لیک مستی نہ کنم
مانا کہ میں پیتا رہتا ہوں، بچتا ہوں مگر بدمستی سے

(۸۲) نیک ست بنام نیک مشہور شدن
اچھا ہے کہ نام نیک رہے خوبوں کا بھی ہم کو سودا ہو

(۸۳) مسکیں دل دردمند دیوانۂ من
دل اپنا تھا مسکیں بے پروا، دیوانہ صفت محروم رہا

(۸۴) چوں آب بجوئبار وچوں بادبدشت
کیا جلا وہ کل کا دن گزرا کیا بات ہے اس کی روانی کی

(۸۵) دردہ مئے لعل لالہ گوں اے ساقی
جب دوست بھی اپنے ساتھی بھی باطن کی صفا سے خالی ہیں

(۸۶) تا بتوانی میل بہ رنداں می کن
مقدور جو تجھ کو ہو جائے رندانِ جہاں کی خدمت کر

(۸۷) گر اسپ و یراق است وگر فیروزہ
راکٹ کی سواری کے اوپر آفاق میں ہر سو اڑتا ہو

(۸۸) ما کافر عشقیم و مسلماں دگر است
ہاں عشق ہمارا مذہب ہے ہم مردِ مسلماں کیا ہوں گے

(۸۹) یکدست بمصحفیم و یکدست بجام

اک ہاتھ میں اپنے مصحف ہے اک ہاتھ میں اپنے ساغر ہے

(۹۰) گو بند بحشر گفتگو خواہد بود
کہتے ہیں کہ روزِ محشر میں وہ تیزیٔ طبع دکھائے گا

(۹۱) باسفلۂ تند خُوئے بے عقل و وقار
کم ظرف مفاد پرستوں میں، بے عقلوں میں لعل ناب نہ پی

(۹۲) آنہا کہ فلک دیدہ و دہر آرانید
جو عارفِ رازِ ہستی ہیں جو دیدہ ورانِ عالم ہیں

(۹۳) قومے متفکراند در مذہب و دیں
قوموں کے ہیں اب بھی سرمائے یہ مذہب و دیں کے ہنگامے

(۹۴) فردا کہ نصیب نیک بختاں بخشند
بن جائے حقیقت حشر اگر اور سب کا حساب اعمال کا ہو

(۹۵) در میکدہ جز بے وضو نتواں کرد
میخانہ کے فرش رنگیں پر مینا سے وضوئے عشرت ہو

(۹۶) یک روز زبندِ عالم آزاد نیم
آزاد رہے اک دن بھی نہ ہم اغراض و ہوس کے بندھن سے

(۹۷) برخیز و بیا کہ چنگ برچنگ زنیم
اٹھ ساز پہ پھر مضراب لگا نغمات کے شعلے برسا دے

(۹۸) آں آہ کہ پیش ہیچ محرم نزنم
محرم نہ ملا جو کوئی ہمیں افسردہ نفس کو روکا ہے

(۹۹) اے دل ز غمِ جہاں کہ گفتت خُوں شو

آلامِ جہاں کا ہر نشتر کیوں دل کے لہو سے رنگیں ہو

(۱۰۰) با مردم پاک اصل و عاقل آمیز
دیکھ اہل خرد کی مجلس میں یہ شغلِ شراب و ساغر ہو

(۱۰۱) ہنگام گل است اختیارے بکنم
ہے موسم گل دل بے قابو سرمستی و جوشِ طبیعت ہے

(۱۰۲) زیں گونہ کہ من کارِ جہاں می بینم
جب رہ کے خیالی عالم میں دُنیا پہ نگاہیں ڈالی ہیں

(۱۰۳) روزیکہ ز تو گذشتہ شد یاد مکن
گزرے ہوئے دن کیوں یاد کریں آئندہ کا غم کیوں آج کریں

(۱۰۴) خارے کہ بزیر پائے ہر حیوانے ست
چبھتے ہیں جو کانٹے تلووں میں تھے خال کبھی رخساروں کے

(۱۰۵) چوں باد بزلف اُو رسیدن مشکل
پہنچیں جو کسی کے گیسو تک یہ ہاتھ ہمارے مشکل ہے

(۱۰۶) من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا ست
یہ عزم و خطا کا شور ہے کیا، کیا ہے یہ رضا کا افسانہ

(۱۰۷) اے وائے براں دل درد سوزے نیست
جو مہر و وفا سے عاری ہے بیکار ہے خشک اک ڈالی ہے

(۱۰۸) ایں چرخ جفا پیشہ دغائے بنیاد
کب چرخ و فلک کے قصے نے مشکل کی گرہ کو کھولا ہے

(۱۰۹) آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند

یکتا جو علوم و فنون میں تھے اور علم و فضیلت رکھتے تھے

(۱۱۰) ہم دست من تشنہ بجامے نرسید
مانا کہ نہ پہنچے منزل تک اور دل کی تمنا پا نہ سکے

(۱۱۱) خیّام اگر بادہ پرستی خوش باش
ہے بادہ پرستی شغل اگر، یہ شغلِ مسرت کیوں نہ رہے

(۱۱۲) در راہِ تو تا اسپ طلب تاختہ ایم
جب شوقِ طرب کا طیّارہ، پرواز میں لائے اے جاناں

(۱۱۳) از واقعۂ ترا خبر خواہم کرد
ہستی کے چمن میں برگِ خزاں کی طرح میں جب کھو جاؤں گا

(۱۱۴) ایں چرخِ فلک بہرِ ہلاکتِ من و تو
پیمانۂ عمرِ فانی کو لبریز بالآخر ہونا ہے!!! !!

(۱۱۵) بشگفت شگوفہ مے بیار اے ساقی
ہے موسمِ گل پیمانہ اٹھا گرتے ہیں شگوفے سبزے پر

(۱۱۶) بشنو ز من اے زبدۂ یارانِ کہن
اے یارِ حسیں، اے شعلہ جبیں، اے جانِ جہانِ غم خواری

در مجلس عشاق نشستیم ہمہ
[illegible]انِ جہاں کی محفل میں ہر ایک کے ہم دمساز رہے

(۱۱۸) [illegible]لر بہ فلکم دست بہ دادے یزداں
[illegible] کو جو قدرت ہو جاتی تقدیرِ جہاں کو بنانے کی

(۱۱۹) [illegible] بر روے گل از ابر نقاب است ہنوز

پھولوں پہ نقابِ سایہ ہے گلشن پہ نقابِ سحابی ہے

(۱۲۰) روزیست خوش و ہوا نہ گرم است نہ سرد
موسم ہے سہانا دن ہے حسیں اور موجِ ہوا میں مستی ہے

(۱۲۱) غم چند خوری ز کار نامدہ پیش
جو حادثہ پیش آیا ہی نہ ہو کیوں پہلے سے اس کا کھٹکا ہو

(۱۲۲) رفتم بخرابات بایمان درست
ہاں عشق و وفائے انسانی ہم بادہ کشوں کا ایماں ہے

(۱۲۳) اجرام کہ ساکنانِ ایں ایوانند
امواجِ حیات، اجرامِ فلک، ایوانِ وجود میں جو کچھ ہے

(۱۲۴) بر مفرش خاک خفتگاں می بینم
مٹی میں بہت سے پھول ملے اور کتنے گہر بھی خاک ہوئے

(۱۲۵) جاناں من و تو نمونۂ پر کاریم !
ہم دونوں ہی نکتے پرکاری پرکار وجود روانہ ہے

(۱۲۶) خیام زمانہ از کسے دارد ننگ
رندانِ جہاں سے کیوں ہو الگ کیوں شکوۂ اہل دنیا ہو

(۱۲۷) گر دست دہد ز مغز گندم نانے
حاصل ہو اگر سیری کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہوتا ہے

(۱۲۸) وقت سحر است خیز اے طرفہ پسر
وہ دیکھ اُفق کے غرفے میں، انوارِ سحر اے شوخ حسیں

(۱۲۹) ہاں تا بخرابات مجازی نائی

تو کھیل اسے سمجھا تو نہ آ، میخانہ تماشا گاہ نہیں

(۱۳۰) گویند بہشت و حورِعین خواہد بود
کہتے ہیں کہ باغِ رضواں میں، حوروں کا جمالِ یکتا ہے

(۱۳۱) از نامد ہا زرد مکن چہرۂ خویش
جو حادثہ پیش آیا ہی نہیں، کیوں پہلے ہی چہرہ زرد کریں

(۱۳۲) برسنگ زدم دوش سبوے کاشی
پتھر پہ سبو کو دے مارا کل رات وفورِ مستی میں

(۱۳۳) من ظاہر نیستی و ہستی دانم
ہستی کا جو ظاہر باطن ہے، وہ میری نظر میں رہتا ہے

(۱۳۴) در مسجد اگرچہ با نیاز آمدہ ایم
مسجد میں اگر ہم آئے ہیں کب سر کو جھکانے آئے ہیں

(۱۳۵) اے خواجہ یکے کام روا کن مارا
اے خواجہ ہمارے حق میں ترا، احساں ہو اگر اک کام کرے

(۱۳۶) درچشم محققاں چہ زیباوچہ زشت
ماہیّتِ ہستی جان چکے، دنیا کی حقیقت دیکھ چکے

(۱۳۷) سر از ہمہ ناقصاں گراں داری تو
ناپختہ و خام انسانوں سے مانا کہ گریزاں رہتا ہے

(۱۳۸) مہتاب بنور دامنِ شب بشگافت
کرنوں کی چلی ہیں سنگینیں وہ دامنِ شب صد پارہ ہے

(۱۳۹) معشوق کہ عمرش چو غمم باد دراز

وہ شوخ کہ جس کو عمر ملے میرے ہی غموں کی درازی کی

(۱۴۰) توبہ مکن از مے اگرت مے باشد
جب تک کہ سبو و ساغر میں اک قطرۂ مے بھی باقی ہے

(۱۴۱) در کارگہے کوزہ گرے بودم دوش
گزرا جو دکانِ کوزہ سے کل، ہر طرز کا ان میں کوزہ تھا

(۱۴۲) افسوس کہ سرمایہ ز کف بیروں شد
تاراج خزاں کے ہاتھوں سے ہر پھول ہر اک گل بوٹا ہے

(۱۴۳) ویشب ز سر صدق صفائے دلِ من
جو ذہن کو روشن کرتی ہے اور دل کو بڑھانے والی ہے

(۱۴۴) آنہا کہ کشندۂ شراب نابند
وہ جن کی بدولت رہتا ہے گردش میں سبو و پیمانہ

(۱۴۵) وقتِ سحر ست خیز اے مایۂ ناز
ہنگامِ سحر ہے جام اٹھا، اے مستِ جمال یکتائی

(۱۴۶) گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور
جو عقل و خرد میں کامل ہیں کر بادہ خوری ان یاروں میں

(۱۴۷) اے دل چو زمانہ می کند غمناکت
قبل اس کے کہ دردِ محرومی کچھ اور تجھے غم ناک کرے

(۱۴۸) ابر آمد و باز بر سرِ سبزہ گریست
وہ دیکھ گھٹائیں گھر گھر کے پھر صحن چمن پر برسی ہیں

(۱۴۹) گویند مرا کہ مے پرستم ہست

میں اہلِ جہاں کی نظروں میں اک حسن پرست شرابی ہوں

(۱۵۰) مقصود ز جملہ آفرینش مائیم
تخلیق کا مقصد ہے جو کوئی تکمیلِ بشر کی منزل ہے

(۱۵۱) امروز کہ نوبت جوانی من است
ہستی کے چمن میں پھولوں کا موسم ہے شبابِ گزراں ہے

(۱۵۲) مے گرچہ حرام ست مدامش مے نوش
اس عہدِ خرد میں آخر کیوں، یوں فکرِ حلال و حرام کریں

(۱۵۳) در مجلس دہر سازِ ہستی پست است
رندوں نے جو ترکِ جام کیا، ترک اپنی متاعِ مستی کی

(۱۵۴) لب بر لب کوزہ بُردم از غایتِ آز
منہ شیشے کے منہ پر رکھ کر میں جب عالمِ کیف میں جھوم گیا

(۱۵۵) نیکی و بدی کہ در نہادِ بشر است
نیکی و بدی ہستی کے دو رخ آئینۂ دل کے اندر ہیں

(۱۵۶) ہر سبزہ بر کنارِ جوئے رستہ است
ندّی کے کنارے سبزہ ہے یا بھیگی مسوں کا رنگ ہے یہ

(۱۵۷) با زلفِ تو گر دست درازی کردم
بھلا جو تمہارے گیسو سے یہ شغلِ حقیقت رکھتا تھا

(۱۵۸) بُت گفت بہ بُت پرست کائے عابد ما
کہتا تھا زبانِ حال سے یہ اک بُت کہ نظارہ کیا دیکھا

(۱۵۹) گویند کہ ماہِ رمضاں گشت پدید

وہ دیکھ اُفق کے جھروکے میں پیشانیٔ ماہ رقصاں ہے

(۱۶۰) ما عاشق و آشفتۂ و مستیم امروز
ہم آج ہیں مست و وارفتہ، ہستی کے جہاں میں پہنچے ہیں

(۱۶۱) جاناں بکدام دست بر خاستہ ای
ہاں طلعتِ حسنِ زیبا سے یہ چاند ستارے چمکے ہیں

(۱۶۲) سیم ارچہ نہ مایۂ خرد مندان ست
جب کھیل ہو سونے چاندی کا کیا بول خرد کا بالا ہو

(۱۶۳) مائیم و مے و مطرب و ایں کنج خراب
محبوب و شراب و مطرب سے ویرانہ ہستی گلشن ہے

(۱۶۴) زاں پیش کہ گورے ز من آگندہ شود
قبل اس کے کہ جسم خاکی کے اجزاء سے خمیر خاک بنے

-------O-------

عکسِ تحریر

غزل

خونِ ہر آرزوئے آشفتہ خو نہ کر
دل کی نگاہ میں مجھے بے آبرو نہ کر

جو ہو سکے تو حسنِ حقیقت دکھا مجھے
مجھ کو خرابِ شعبدۂ رنگ و بو نہ کر

یا داغ دیجے اشکِ ندامت سے دھو کے
یا چاک دامنوں کے لیے آرزو نہ کر

حاصل جو کچھ ہو چشمِ حقیقت نگر نہیں
یہ جستجو بھی خام ہے پھر جستجو نہ کر

اے بارگاہِ حسن میں خاموشیوں سے کام
یعنی یہ طرزِ عام کوئی گفتگو تو کر

ہر چاکِ دل سے ہم نے دیکھا ہزار لطف
دو ایک چاک اور بھی امیدِ رفو نہ کر

جب کوئی نظر سے ملا کے رشتۂ عشق
دل تو دیتی بادہ و جام و سبو نہ کر

جب لطف ہے یتیم کہ ہمراہ ہو کوئی
تنہا نور میں سیرِ لبِ آبجو نہ کر

کتابیات

کتابیں:

(۱)- فوق، محمد الدین، تاریخ اقوام کشمیر، لاہور، مجلس ترقی ادب، جلد سوم -۱۹۳۴ء، ص ۷۸

(۲)- گوہر، مسز مختار اختر، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء - ص ۱

ادبی رسائل:

(۱)......ادبی دنیا.........لاہور

(۲)......ادب لطیف.......لاہور

(۳)...... ان ق......لاہور

(۴)......دستور......لاہور

(۵)......دوست......لاہور

(۶)......سویرا ....لاہور

(۷)......مخزن ....لاہور

(۸)......مشرب...... کراچی

(۹)......نقوش ....لاہور

(۱۰)......نیرنگ خیال.....لاہور

(۱۱)......ہمایوں ....لاہور

روزنامے:

۱- آفاق ....لاہور

۲- آفتابِ جدید........ بھوپال (بھارت)

۳- امروز...................لاہور

۴- کوہستان ....لاہور

۵- نوائے وقت.........لاہور

